قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم
استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر
عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر
مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر
مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد:۰۳	شمارہ:٦	ماہ دسمبر ۲۰۲۲ء	ماہ جمادی الثانی ۱۴۴۴ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

- مفتی محمد علی صاحب قاسمی
- مولانا محمد اُویس صاحب رشادی
- مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

- مولانا اشرف صاحب قاسمی
- مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری
- مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست مضامین

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	فیفا ورلڈ کپ اچھے اور بُرے نتائج	عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ حدیث	دنیا میں مسافر کی طرح رہو	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۶
اصلاحِ معاشرہ	ارتداد کی طرف بڑھتے قدم	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۱۱
// // /	جلتا نہیں خود سے دِیا احتساب کر	مولانا عمرین محفوظ رحمانی صاحب	۱۶
// // //	طلبۂ عزیز سے صاف صاف باتیں (قسط دوم)	مولانا محمد اویس صاحب رشادی	۱۸
// // //	غزوۂ تبوک میں پنہاں تربیتی پہلو	مولانا محمد حنیف صاحب	۲۶
// // //	دَورِ حاضر میں اولاد کی تربیت	مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی	۳۷
// // //	پڑوسیوں کے حقوق	مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری	۴۳
معارف ومسائل	فجر کی سنت کب تک ادا کر سکتے ہیں	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	۴۹

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کر سکتے ہیں، **جزاکم اللّٰہ خیراً وأحسن الجزاء.**

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

اداریہ

فیفا ورلڈ کپ اچھے اور بُرے نتائج

از: عبدالرزاق بنگلوری

فیفا ورلڈ کپ میچ دیکھنے کی بیماری تقریباً دنیا کے ہر فرد کے رَگ وریشے میں بس گئی ہے، یہ ایسی لاعلاج بیماری ہے کہ جس کسی انسان کے بھی اندر داخل ہوجائے اس کا ختم کرنا ناممکن اور بہت مشکل ہوجاتا ہے، جس کو اس کی لَت لگ جائے وہ اس کو دیکھے بغیر سکون محسوس نہیں کرتا، یہودیوں کے مختلف پروپیگنڈوں میں سے سب سے بڑا اور مؤثر پروپیگنڈا ہے کہ لوگوں کو کھیل کی دنیا میں لاکر ان کو اپنے مقصدِ اصلی سے ہٹادیا جائے؛ حالانکہ ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے؛ لیکن فٹبال کے جنون نے امت کو مقصد سے بیگانہ کردیا، لوگ اپنی کمائی چھوڑ کر فٹبال دیکھنے میں مشغول ہیں، نماز کا وقت چلا جائے ہوش بھی نہ رہے گا، اگر اپنی چاہت کی ٹیم کی ہار ہوجائے تو کھانا نہیں کھاتے، محسوس تو یوں ہوتا ہے کہ گھر کے کسی فرد کا انتقال ہوگیا ہے، اپنی ٹیم کو جتانے کے لیے شرطیں لگائی جاتی ہیں، جو شریعت میں بالکل ناجائز اور حرام کام ہے، بچپن کے بھائی اور ایک لمبی مدت کے دوست صرف فٹبال کے نشے میں ایک دوسرے سے روٹھ جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دوست ایک ٹیم کو لائک کرتا ہے، تو دوسرا دوست دوسری ٹیم کا گرویدار رہتا ہے، آپس میں پیسوں کی شرطوں نے بھائیوں کے گھر الگ کردیے، جو زندگی بھر ساتھ میں رہے، صرف دو پیسوں کی خاطر گھر کے کئی ٹکڑے ہوگئے اور میچ دیکھنے کے آلے الگ ہوگئے، دینِ اسلام لٹتا جارہا ہے، گھر اُجڑا جارہا ہے، مائیں، بہنیں لُٹ رہی ہیں، انھیں احساس تک نہیں ہے، فٹبال کے نشے میں مست ومگن خوفِ خدا سے کوسوں دُور شیطانی گولے کی تباہ کاریوں میں سرشار ہیں۔

فیفا ورلڈ کپ کی شرعی حیثیت:

اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کو زندگی بطور امانت دی ہے، میدانِ حشر میں زندگی اور مال ودولت کے بارے میں سوالات ہوں گے، اس وقت ہمارا کیا جواب ہوگا؟ ہم نے تو ساری زندگی لایعنی کاموں، کھیل کود اور ناچ گانوں میں گزاردی، آخر کار موت ہمارے سر پر کھڑی تھی، پھر موت نے ہمیں دبوچ لیا، ہمیں احساس تک نہیں ہوا، کرکٹ کھیلنا فی نفسہٖ قبیح اور ناجائز عمل تو نہیں ہے، اور جسم کی ورزش اور بدن کی تندرستی بڑھانے کے لیے بطور ورزش کوئی بھی ایسا کھیل جائز ہے جو شریعت کو پامال نہ کرتا ہو، اور اس میں مناسب لباس یعنی ستر پوشی اور حدود کی

رعایت کے ساتھ ساتھ کھیلنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس کھیل میں تماشائی اور ہار جیت میں معاوضہ وغیرہ نہ ہو، اور نماز باجماعت سے اور اپنی دینی و دنیاوی اور معاشی ذمہ داریوں سے غفلت نہ ہو؛ مگر دخولِ اغیار واغراض نے اس کو ناجائز بنادیا ہے؛ لیکن افسوس صد افسوس کہ آج کل میچ دیکھنے کے آلہ جات کی کثرت کی وجہ سے بہت سے مدارس کے طلباء اور علماء بھی اس گھناؤنی سازش میں مبتلا ہیں؛ کیوں کہ ہر ایک کے پاس ملٹی میڈیا موبائل موجود ہے، اور فٹبال میچ دیکھتے وقت درمیان میں ایسے بے حیائی، فحاشی، عریانیت اور مخرب اخلاق پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں، لوگ اس کی وجہ سے جن شرمناک حرکتوں میں ملوث ہورہے ہیں، وہ ناقابلِ ذکر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَايَعْنِيْهِ". (سنن ترمذی:۵۸/۲)

اسلام کے اندر بے کار اور بکواس کاموں کی کوئی جگہ نہیں ہے، ایسے نازیبا اور ناشائستہ حرکتوں سے اسلام پاک وصاف ہے، فٹبال میچ دیکھنا محض وقت کا ضیاع ہے، اس سے نہ دنیا کا فائدہ ہے اور نہ دین سے کوئی وابستگی ہے، اس میں سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے؛ حالانکہ وقت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دنیا کی زندگی اور اس کا مال واسباب عارضی اور فانی ہے، ہر نفس نے یہاں اپنی مقررہ مدت گزارنے کے بعد دارِ آخرت کو کوچ کرنا ہے جو مستقل اور ابدی ٹھکانہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ موت برحق ہے، اس عقیدہ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی ہم اس دنیا میں غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں اس کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہے۔ وقت ایک ایسی چیز ہے جسے آپ کسی بھی کرنسی کے عوض خرید نہیں سکتے، یہ انسان کا ایسا محفوظ سرمایہ ہے جو اس کو دنیا اور آخرت میں نفع دیتا ہے۔ دنیا میں انسان اگر کسی قیمتی چیز کو کھودے تو اُمید ہوتی ہے کہ وہ چیز شاید اسے پھر کبھی مل جائے اور بعض مرتبہ اسے مل بھی جاتی ہے؛ لیکن وقت ایسی چیز ہے جو ایک بار گزر جائے تو پھر اس کے واپس آنے کی ہرگز اُمید نہیں کی جاسکتی؛ کیونکہ گزرا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔

بحیثیت مسلمان ہمیں باقی مذاہب کے ماننے والوں سے بڑھ کر وقت کی قدر کرنا چاہیے؛ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیوی زندگی، آخرت کے لیے کھیتی کی مانند ہے۔ ہم اس میں جو بوئیں گے آخرت میں وہی کاٹیں گے، اگر ہم اس زندگی میں اپنے وقت کی قدر کرتے ہوئے اسے بھلائی، خیر اور حسنات کے بیج بونے میں صَرف کریں گے تو کل یومِ قیامت ہمیں فلاح ونجات کا ثمر ملے گا۔

آج لوگ گمراہیت کے دلدل میں ڈوب رہے ہیں، ایسے نازک وقت میں ڈوبتی کشتی کا ملاح علماءِ کرام کے سوا کوئی نہیں ہے؛ اِس لیے کہ علماء ہی امت کے ذمہ دار ہیں، انبیاء علیہم السلام کے وارثین ہیں، خود کو اس فعلِ بد سے بچا کر دوسروں کو بھی اس غلط فریب سے بچانا ہوگا، اور اس دنیا کو صحیح اور سیدھا رُخ دکھانا ہوگا، اور امت کو شکستہ حالی سے خوشحالی کی طرف منتقل کرنا ہوگا۔

حرفِ آخر:

میں ان بُرائیوں میں مبتلا آدمیوں سے التماساً عرض کرتا ہوں کہ ہم خود کی قدر ومنزلت پر غور کریں، اور ہمارے انجام کو سوچیں، خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے درد ودرما سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ہمارے سارے مسائل کا حل تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، آج کی انسانیت کو یہ راز کون بتائے؟ مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ لیکن خود اسلامی تعلیمات سے عاری مسلمان دوسروں کو کیسے تلقین کر سکتے ہیں، الغرض یہ ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے، ہماری گردنوں پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو نبھانا پڑے گا، اپنے طرزِ عمل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا، ظاہری بے روح حرکات سے ہم دنیا والوں کو تو فریب دے سکتے ہیں؛ لیکن اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فریب نہیں دے سکتے، آج کی انسانیت فٹبال اور دیگر لہو ولعب میں لگ کر سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محرومی کے سبب تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے؛ لہٰذا ہم دعا گو ہیں کہ اے اللہ! ہم سب کو مکر وفریب سے حفاظت فرما، صحیح اور سیدھے راستے پر چلنے اور اس پر جمے رہنے کی توفیق عطا فرما۔ (آمین)

درسِ حدیث

دنیا میں مسافر کی طرح رہو!

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبَيَّ فَقَالَ: كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ. (بخاری: ج ٢/ ٩٤٩، رقم الحدیث ٦١٦٩)

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کے ایک حصہ (یعنی دونوں مونڈھوں) کو پکڑ کر فرمایا: ''تم دنیا میں اِس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر ہو، اور تم اپنا شمار ان لوگوں میں کرو جو دنیا سے گزر گئے ہیں اور اپنی قبروں میں آسودۂ خواب ہیں (یعنی تم مُردوں کی مشابہت اختیار کرو کہ جس طرح وہ دنیا کی تمام چیزوں سے منہ موڑ کر ایک گوشہ میں پڑے ہوئے ہیں اسی طرح تم بھی دنیاداری کے علائق سے اپنا دامن بچا کر نہایت سادگی اور یکسوئی کے ساتھ زندگی گزارو)''۔

تشریح:

دنیا چونکہ دارالعمل ہے، ایک کامیاب مؤمن کی نشانی یہ ہے کہ وہ آخرت کی تیاری میں مشغول رہے، اور آخرت کے لیے دنیا میں رہتے ہوئے جو کچھ کرسکتا ہے اس میں کوتاہی وغفلت نہ کرے، دنیا کی زندگانی کے بارے میں ربِّ ذوالجلال کا فرمان ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ اورنہیں زندگانی دنیا کی مگر پونجی دھوکے کی۔

(سورۂ آلِ عمران، رق الآیۃ ١٨٥، رکوع نمبر ١٩) (شیخ الہندؒ)

یعنی دنیا کی عارضی بہار اور ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت دھوکہ میں ڈالنے والی چیز ہے جس پر مفتون ہوکر اکثر بیوقوف آخرت سے غافل ہوجاتے ہیں؛ حالانکہ انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ یہاں رہ کر انجام کو سوچے اور وہ کام کرے جو عذابِ الٰہی سے بچانے والا اور جنت تک پہنچانے والا ہو۔ (فوائدِ عثمانی)

اس دنیا کی زندگانی میں محنت، مشقت اور آزمائشیں ہیں، مؤمن اس سے بچتا ہوا آخرت کی تیاری میں لگا رہے، آخرت کی بہترین تیاری تقویٰ ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی، وَالتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ﴾

اورزادِراہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر فائدہ زادِراہ کا بچنا ہے سوال سے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو!۔

(پ:۲، سورۃ البقرہ، رقم الآیۃ۱۹۷، رکوع ۲۵)

(شیخ الہندؒ)

تشریح:

چونکہ دنیوی توشہ کا حکم دیا تو ساتھ ہی فرماتا ہے کہ آخرت کے توشہ کی بھی تیاری کرلو، یعنی اپنی قبر میں اپنے ساتھ خوفِ خدا لے کر جاؤ، جیسے اور جگہ لباس کا ذکر کر کیا رشاد فرمایا ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ﴾ پرہیزگاری کا لباس بہتر ہے یعنی خشوع، خضوع، طاعت وتقویٰ کے باطنی لباس سے بھی خالی نہ رہو؛ بلکہ یہ لباس ظاہری لباس سے کہیں زیادہ بہتر اور نفع دینے والا ہے۔

ایک حدیث میں بھی ہے کہ ''دنیا میں اگر کروگے تو آخرت میں پاؤگے، یہاں کا توشہ وہاں فائدہ دے گا''، اِس حکم کو سن کر ایک مسکین صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یارسول اللہ! ہمارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اتنا تو ہونا چاہیے جس سے کسی سے سوال نہ کرنا پڑے، اور بہترین خزانہ خوفِ خدا ہے''۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو، یعنی میرے عذابوں سے، میری پکڑ دھکڑ سے، میری گرفت سے، میری سزاؤں سے ڈرو۔

اسی طرح قرآن مجید میں مختلف مقامات پر تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید آئی ہے، مختلف زاویے سے ربِّ ذوالجلال نے بالخصوص مؤمن بندوں کو تقویٰ کے اختیار کرنے کی ترغیب ارشاد فرمائی ہے، اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دنیا سے کم واسطہ کی تعلیم دی ہے؛ چونکہ جب انسان دنیا کی طرف زیادہ دھیان اور توجہ دیتا ہے تو بہت ساری آزمائشوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، واجبات اس سے چھوٹ جاتے ہیں، محرمات کا ارتکاب اس سے ہونے لگتا ہے، اسی وجہ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دنیا سے بے رغبتی اختیار کرلو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤگے، اور لوگوں سے استغناء سے رہو تو لوگوں کے محبوب بن جاؤگے''، جب آدمی کی نگاہیں لوگوں کے اموال پر جاتی ہیں تو نتیجہ میں لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، جو بھی آدمی سوال کا عادی ہوجاتا ہے وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر جاتا ہے، اس کے مقابل جو بندہ لوگوں سے استغناء کا معاملہ کرتا ہے لوگ خود اس سے اس کی حاجتیں معلوم کر کے مکمل کرتے ہیں اور ایسا آدمی لوگوں کا محبوب بن جاتا ہے، آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو چیزیں تمھیں نفع پہنچاتی ہیں اس کی طلب میں رہو اور ہر کام اور معاملہ میں اللہ ہی سے مدد مانگو''۔

انسان جب رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کے لیے کوششیں کرتا ہے تو لوگوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور لوگوں کے اموال سے نگاہیں ہٹ جاتی ہیں، جب دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے تو بندہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے؛ چونکہ اس بندہ نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی اور دنیا کے مقابلے میں اپنے رب کی اطاعت کو فوقیت دی، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کو بالکل ترک کر دے؛ بلکہ حصولِ دنیا کے جائز طریقوں کو اپنائے اور اسباب کی کوشش میں لگا رہے جیسے تجارت ہے یا کوئی اور ہنر میں اپنے کو مشغول رکھے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری نفع کی چیزیں جائز طریقوں سے حاصل کرو اور اللہ سے پُر اُمید رہو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: ''آدمی کی اپنی محنت کی کمائی، اور ہر جائز تجارت''۔

ایک اور حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی اپنی رسی لے کر جائے اور اس سے لکڑیوں کا ایک گٹھڑ اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور اس کو فروخت کرے اس کمائی کے ذریعہ اپنی روزی کا بندوبست کرے، یہ بات اس چیز سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے، اس سوال کا بدلا لوگ چاہیں تو دیں یا منع کر دیں''۔

ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کے لیے جو حلال روزی ہے اس کو اسباب اپناتے ہوئے شرعی اور حلال طریقہ سے حاصل کرے؛ لیکن باوجود کمانے کے اس کا دل دنیا سے لگا ہوا نہ ہو؛ بلکہ کمانے کے اسباب کے ساتھ آخرت سے لگا ہوا ہو۔

بسا اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دن یا دو دن ایسے گزرتے تھے جس میں پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کوئی چیز نصیب نہیں ہوتی تھی، آپ علیہ السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر کئی ایام ایسی بھوک کی سختی کے ساتھ گزرے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو وسعتیں عطا فرمائیں اور اللہ نے اپنے فضل سے خاص رزق کی کشادگی فرمائی؛ اِسی لیے آپ علیہ السلام نے ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ''دنیا میں اجنبی کی طرح رہو یا راہ گزر کی طرح رہو''۔

(۱) دونوں کا فرق یہ ہے کہ بعض اوقات مسافر چل رہا ہوتا ہے اور بعض اوقات کچھ دیر کے لیے کہیں عارضی اقامت بھی اختیار کر لیتا ہے، پہلی صورت میں وہ عابر سبیل ہے، دوسری صورت میں اجنبی۔

(۲) پردیسی آدمی اگر کہیں کچھ دیر کے لیے ٹھہر بھی جائے تو وہ دل نہیں لگاتا؛ کیونکہ اس کی منزل آگے ہوتی ہے، زیادہ سامان اور جائیداد نہیں بناتا؛ کیونکہ اسے وہاں رہنا نہیں ہوتا اور اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کا لباس

اور وضع قطع اس شہر کے لوگوں جیسی ہے یا نہیں؛ کیونکہ اس کو وہاں سے جانا ہوتا ہے، اس کا لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں ہوتا؛ کیونکہ وہ اس کے ہم وطن نہیں ہوتے اور جو مسافر ابھی راستہ کی منزلیں طے کر رہا ہو وہ اتنا سامان بھی نہیں اُٹھاتا جو کسی پردیسی کے عارضی اقامت کے دَوران جمع ہو جاتا ہے، صرف اتنا سامان ساتھ لیتا ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔

حدیث میں رہنمائی کی گئی کہ پردیسی کی طرح دنیا میں رہ یا راہ گیر کی طرح، دونوں طرح اجازت ہے؛ مگر اسے وطن نہ بنالو، یا "اَوْ" بمعنیٰ "بَلْ" ہے یعنی دنیا میں پردیسی کی طرح رہو؛ بلکہ (بہتر ہے کہ) راہ گیر کی طرح رہو، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں زہد اختیار کرو اور صرف اتنے سامان پر گزارا کرو جس کے بغیر چارہ نہیں۔

عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: "شام ہو جائے تو صبح کے منتظر نہ رہو اور صبح کے وقت شام کے منتظر نہ رہو، اپنی صحت کو مرض سے پہلے غنیمت جانو اور زندگی کو موت سے پہلے"۔

"جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار نہ کرو" یہ عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے، یعنی لمبی اُمیدیں نہ باندھ؛ بلکہ اپنی موت کو بالکل قریب سمجھ، جب موت انسان کی پیشِ نظر ہو تو وہ ہر وقت ایسی حالت میں رہتا ہے کہ موت آجائیا سے ندامت نہ ہو، ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہے اور موت کے لیے تیار رہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (پ:٤، سورۂ آلِ عمران، رقم الآیة ١٠٢، رکوع نمبر: ١١)

اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہیے اُس سے ڈرنا اور نہ مریو مگر مسلمان۔

(شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی ہر مسلمان کے دل میں پورا ڈر خدا کا ہونا چاہیے کہ اپنے مقدور بھر پرہیز گاری و تقویٰ کی راہ سے نہ ہٹے اور ہمیشہ اس سے استقامت کا طالب رہے۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ تمہارا قدم اسلام کے راستہ سے ڈگمگا دیں، تم کو چاہیے کہ انہیں مایوس کرو اور مرتے دم تک کوئی حرکت مسلمانی کے خلاف نہ کرو، تمہارا جینا اور مرنا خالص اسلام پر ہونا چاہیے۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ صحت اور زندگی ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں، بیماری اور موت بھی انسان کی گھات میں ہیں؛ اِس لیے اسے چاہیے کہ صحت کی حالت میں بیماری کے لیے اعمال ذخیرہ کرلے اور زندگ میں موت کے لیے سامان مہیا کرلے۔

خلاصہ یہ کہ انسان معاش کی طلب اپنے لیے اولاد اور ماں باپ کے لیے کرے، کسبِ معاش میں حکمت اور عمدہ باتوں کا سہارا حاصل کرے اور شریعت کی پاسداری کرے، چاہے تجارت میں ہو یا کھیتی باڑی میں یا اور کسی ہنر میں مشغول رہے، آخرت کو مقصود بنائے، اللہ کے احکامات کو بخوشی بجالائے اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے باز آئے اور آخرت کے اعمال میں حرص کرے، دنیا کی مشغولی آخرت س غافل نہ کرے، یہ اس حدیث کا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا خلاصۂ کلام ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا سے دل لگانے اور اسی کو مقصود بنانے سے محفوظ رکھے، آخرت کے خیال کے ساتھ دنیا کی زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔

اصلاحِ معاشرہ

ارتداد کی طرف بڑھتے قدم!

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، ترجمان وسکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

ایمان کچھ حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے، جن میں سب سے اہم اللہ پر، رسول پر، اللہ کی کتاب پر اور آخرت پر ایمان لانا ہے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایمانیات ہی پر زور نہیں دیا؛ بلکہ عبادات، معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی ہدایات سے سرفراز فرمایا اور پوری قوت اور تاکید کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کو ان تعلیمات پر کاربند رہنے کی تلقین فرمائی؛ کیوں کہ کسی قوم کے لیے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا صرف عقیدے کے ذریعہ ممکن نہیں؛ بلکہ تہذیب ومعاشرت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ہیں جو آج ہندوستان کا حصہ بن چکی ہیں، وہ اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے اپنا الگ وجود رکھتی ہیں؛ لیکن انھوں نے دوسری قوموں سے ماجی اور تہذیبی فاصلہ قائم نہیں رکھا، رہن سہن، لباس وپوشاک، خورد ونوش، شادی بیاہ، خوشی اور غم کی تقریبات وغیرہ میں انھوں نے اپنا رنگ برقرار نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنا تشخص کھودیا اور آج ہندوستان ان کو اپنا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اِس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کردیا جائے؛ کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی سماجی انفرادیت سے محروم ہوجاتی ہے، تو وہ آہستہ آہستہ دین ومذہب ہی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے اور اگر وہ کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل نہ ہو، جب بھی الحاد وانکار کا راستہ اختیار کرلیتی ہے، یا کم سے کم وہ مذہب کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرلیتی ہے، غیر سنجیدہ رویہ سے مراد یہ ہے کہ مذہب سے اس کی کوئی ذہنی اور فکری وابستگی نہیں ہوتی؛ البتہ وہ اسے ایک خاندانی روایت سمجھ کر ڈھوتی رہتی ہے، مذہبی اقدار پر اس کا کوئی یقین نہیں ہوتا؛ البتہ خاندانی روایت کے تحت خاص خاص مذہبی تقریبات اور تہواروں میں اس کی شرکت ہوجاتی ہے اور گاہے گاہے کچھ عبادت کی توفیق میسر آجاتی ہے؛ لیکن حلال وحرام، معاملات، کسبِ معاش اور سماجی زندگی میں مذہب کے لیے کوئی خانہ نہیں ہوتا، اسی کیفیت کو میں نے ''تہذیبی ارتداد'' سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ارتداد بے پاؤں آتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر داخل ہوتا ہے اور ایسا میٹھا زہر بن کر حلق سے اُترتا ہے کہ

زہر کھا کر بھی انسان تحسین وآفریں کے کلمات کہہ اُٹھتا ہے، یہ ارتداد نہ سوئے ہوؤں کو جگاتا ہے، نہ غافلوں کو متوجہ کرتا ہے، نہ فکرمند دلوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے، نہ قلب وذہن کو جھنجھوڑتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، یہ اس بیماری کی طرح ہے، جو بظاہر ہلکی ہو؛ لیکن بتدریج انسان کو موت کی طرف لے جائے اور یہ ایسا نشہ ہے کہ مقتول خودقتل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے؛ اِس لیے اس ارتداد کو خوب سمجھنے، اس کے اسباب پر نظر رکھنے اور اس کے نتائج وعواقب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت پوری دنیا جو بنیادی طور پر یہودی دماغ اور یہودی منصوبہ بندی کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے اور اس کے اشارۂ چشم وابرو پر رقصاں ہے، اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ اگر مسلمانوں کو کھلے عام مرتد نہیں کیا جاسکتا، تو ان پر ایسی زبردست تمدنی یلغار کردی جائے کہ وہ خوشی خوشی تہذیبی ارتداد کو قبول کرلیں اور اس مقصد کے لیے اتنے طاقتور حربے استعمال کیے جارہے ہیں، بظاہر اس سے زیادہ دُوررس اور قوی ومؤثر کوئی اور ذریعہ نہیں، ٹی وی نے اس رفتار کو بہت تیز کردیا ہے اور ڈِش انٹینا کی وجہ سے مسلمان اور مشرقی ملکوں میں ایسے فحش پروگرام کا ایک طوفان سا آگیا ہے کہ جن کا اسلام اور مسلم سماج میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اب انٹرنٹ نے اس تہذیبی یلغار کو مزید طاقتور بنادیا ہے اور ایک ایسی چیز جو بہترین تعمیری اور تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال ہوسکتی تھی، وہی چیزیں انتہائی تخریبی اور غیر اخلاقی مہم جوئی کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں، اب جو نئی معاشی اصلاحات کا عمل پوری دنیا میں جاری ہے اور ''عالمیانے'' کی نئی اصطلاح شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی صحافت، مغربی لٹریچر اور مغربی کمپنیوں کے وساطت سے مخرب اخلاق غذائی اور غیر غذائی اشیاء کی آمد کا ایک سیلِ بلا جاری وساری ہے۔

اس وقت اس منصوبہ کے نقوش مشرقی علاقوں میں اور مسلم ملکوں میں نہایت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، ادھر چند سالوں میں عرب اور اسلامی ممالک میں خواتین کے لباس اس قدر تبدیل ہوگئے ہیں کہ امریکی ویورپی ملبوسات اور عرب خواتین کے ملبوسات میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، بہت سے عرب اور مسلم ممالک وہ ہیں جہاں عوام تو کجا، علماء بھی ڈاڑھی نہیں رکھتے، ڈاڑھی جسے کسی زمانہ میں صلاح وتقویٰ اور شرافت واعتماد کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب دہشت گردی اور شدت پسندی کی پہچان سمجھی جاتی ہے، مجھے ایک بار حج کے موقع سے مکہ مکرمہ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جس کے استقبالیہ پر ایک دین دار، خوش شکل، مصری نوجوان لڑکا بیٹھا کرتا تھا اور اس کے چہرے پر ڈاڑھی بہت بھلی محسوس ہوتی تھی، میں اکثر عشاء کے بعد مسجد سے واپس ہوتے ہوئے دوچار منٹ اس کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی مذہب پر، کبھی عربی زبان کے بارے میں اور کبھی مصر میں مسلمانوں کے حالات کے متعلق اس سے گفتگو ہوتی، وہ بہت برجستہ اور بہت ہی بلیغ اور سہل عربی زبان میں گفتگو کرتا اور بہت

ہی اخلاق ومروت سے پیش آتا؛ اِس لیے اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے لطف سا آتا تھا، میں نے ایک دن کہا کہ مصر کے لوگ اکثر ڈاڑھی نہیں رکھتے؛ لیکن تم نے جو یہ ڈاڑھی رکھی ہے، یہ بہت اچھی بات ہے، اس سے تمہارے چہرے پر ایک نورانیت اور معصومیت سی معلوم ہوتی ہے، میری یہ بات سن کر وہ افسردہ سا ہوگیا اور اس نے سنجیدہ ہوکر کہا کہ شیخ آپ سچ کہتے ہیں، میں داڑھی رکھنا چاہتا ہوں؛ لیکن مصر میں ڈاڑھی رکھنے میں بڑی مشکلات ہیں، ہمارے یہاں ڈاڑھی رکھنے والوں کو باضابطہ اپنا رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے، میں جب پہلی بار ڈاڑھی رکھ کر اپنے وطن گیا تو مجھے سات آٹھ گھنٹہ ایئرپورٹ پر تفتیش کے لیے روک لیا گیا اور میرے پورے اہلِ خاندان کو طلب کیا گیا، جن میں میری ماں اور بہنیں بھی تھیں اور ان سے بھی کافی دیر تک تفتیش کی گئی، اس کے بعد سے مجبوراً میں مصر جاتے ہوئے اپنی ڈاڑھی صاف کرالیتا ہوں اور واپسی کے بعد پھر ڈاڑھی رکھ لیتا ہوں۔

غور کیجیے! کیسا غضب ہے کہ ایک مسلمان ملک میں مسلمانوں کو ڈاڑھی رکھنے کی اجازت نہ ہو، کاش! یہ اسرائیل ہی سے سبق حاصل کرتے جہاں یہودی مذہبی طبقے کے ڈاڑھی رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جب مسلمان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ حال ہے تو ان مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے، جو مغربی ثقافت کی آغوش میں محوِ غفلت ہیں اور اسے دنیا ہی میں جنت تصور کرتے ہیں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی ممالک نے عرب اور اسلامی ممالک اور مختلف علاقوں میں بسنے والے تارکینِ وطن مسلمانوں کے لیے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنا دامن کھول رکھا ہے، انھیں شہرت دیجاتی ہے، انھیں ملازمت اور مدوری کے مواقع ملتے ہیں، اور انھیں اپنے ملکوں سے بڑھ کر شہری حقوق دے دیے جاتے ہیں، تارکینِ وطن خوش ہیں کہ انھیں پھلنے، پھولنے اور آگے بڑھنے کے بھرپور مواقع ہاتھ آرہے ہیں؛ لیکن انھیں نہیں معلوم کہ وہ ان ممالک کے ہاتھوں اپنی اگلی نسلوں کا سودا کررہے ہیں؛ چنانچہ لاکھوں عرب اور فلسطینی جو پچاس سال پہلے امریکہ گئے، اب ان میں اپنے مسلمان ہونے کی پہچان بھی باقی نہیں رہی، مذہبی شعور، رُخصت ہوا، رہن سہن بدل گیا، زندگی کے طور وطریق تبدیل ہوگئے، یہاں تک کہ ان کے نام میں بھی مسلمانیت کی کوئی بو باقی نہیں رہ گئی ہے؛ حالاں کہ ان کے آباء واجداد راسخ العقیدہ مسلمان اور عرب تہذیب کے علمبردار بن کر یہاں آئے تھے، اگر آج ان گزری ہوئی روحوں کو دوسری زندگی دے دی جائے تو شاید ہی وہ خود اپنی نسل اور اپنی اولاد کو پہچان سکیں، یہ ہے اس تہذیبی ارتداد کا اثر، جو بتدریج افراد واقوام کو فطری اور اعتقادی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس نے کسی قوم کی مشابہت اور مماثلت اختیار کی وہ اُن ہی میں سے ہوگیا۔ اس روایت کو امام ابوداؤدؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور امام طبرانیؒ

نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور علامہ سیوطیؒ نے اس حدیث کو ''حسن'' یعنی مقبول قرار دیا ہے۔ (الجامع الصغیر، حدیث نمبر: ۸۵۹۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں عقیدہ و ایمان میں غیر مسلموں سے مماثلت مراد نہیں ہے؛ کیوں کہ جو شخص عقیدہ کے اعتبار سے غیر اسلامی فکر اختیار کر لے، وہ تو پہلے ہی سے مسلمان نہیں ہے، اس کے غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے کے کیا معنیٰ ؟ لہٰذا اس حدیث میں عملی اور سماجی زندگی میں غیر مسلموں کے تشبہ سے منع فرمایا گیا ہے اور مختلف مسائل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح توضیح نے اس نکتہ کو مزید واضح کیا ہے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج نکلنے، سورج ڈوبنے اور سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسند بزار: ۸۶/۳، حدیث نمبر: ۸۵۸) اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ یہی اوقات عام طور پر مشرک اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے رہے ہیں، جو قومیں سورج کی پرستار ہیں، وہ ان ہی اوقات میں سورج کی پوجا کرتی ہیں؛ اِس لیے ان اوقات میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا۔

روزہ میں حکم دیا گیا کہ افطار جلدی کیا جائے، افطار میں تاخیر نہ کی جائے؛ کیوں کہ افطار میں تاخیر اہلِ کتاب کا طریقہ ہے، یومِ عاشوراء کے ساتھ مزید ایک روزہ رکھنے کا حکم ہوا؛ کیوں کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھا کرتے تھے؛ تاکہ مسلمان اپنی عبادت میں ان سے ممتاز رہیں، حج میں بہت سے ایسے افعال جن کو مشرکین بہت اہمیت دیتے تھے، اسلام نے ان کو ختم کیا، یا ان میں تبدیلی پیدا کی، پھر یہی ہدایات آپ نے وضع قطع اور لباس و پوشاک کے بارے میں بھی دی، مجوسی داڑھی منڈایا کرتے تھے، بعض قومیں ڈاڑھی بڑھایا کرتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا، اہلِ ایران اظہارِ فخر کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑے پہنتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اہلِ مکہ سر میں مانگ بھی نکالا کرتے تھے؛ چنانچہ مکی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدھے بال رکھنے کو پسند فرمایا؛ تاکہ مسلمان ان سے ممتاز رہیں، مدینہ میں یہود سیدھے بال رکھتے تھے، تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگ نکالنے کو پسند فرمایا، پھر جب تمام عرب نے اسلام قبول کر لیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طرح بال رکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی، اسی طرح عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے، یا صرف عمامہ باندھتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ابتداءً ہدایت دی تھی کہ وہ ٹوپی اور عمامہ دونوں کا استعمال کریں؛ تاکہ ان کے اور مشرکوں کے درمیان امتیاز باقی رہے، بعد کو جب اہلِ عرب ایمان لے آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ٹوپی یا صرف عمامہ کے استعمال کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

دین کا یہ مزاج کہ مسلمانوں کو قومی اعتبار سے دوسری اقوام سے ممتاز اور مشخص رہنا چاہیے، فقہاء نے بھی اپنے اجتہاد واستنباط اور قانونِ شرع کی تشریح وتوضیح میں ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھا ہے اور لباس وپوشاک، خورد ونوش، عبادات، یہاں تک کہ عبادت گاہوں کے طرزِ تعمیر وغیرہ ہر مرحلہ پر ایک بنیادی اُصول کی حیثیت سے اس بات کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ مسلمان ایک امتیازی شان کے حامل ہیں اور وہ اپنے دین ومذہب اور تہذیب وتمدن میں دوسری قوموں سے ممتاز اور مشخص رہیں؛ کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیب سے محرم ہوجاتی ہے اور تمدن وثقافت کے میدان میں دریوزہ گری پر اُترتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے فکر وعقیدہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

ہندوستان میں اس وقت اس بات کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان نماز پڑھیں، مسجدوں کو جائیں، عید بقرعید وغیرہ کرلیا کریں؛ لیکن اسلامی تہذیب کو خیرباد کہہ دیں، اس کے لیے بظاہر معمولی؛ لیکن نتائج کے اعتبار سے دُوررَس اقدامات کیے جارہے ہیں، نصابِ تعلیم میں تبدیلی لائی جارہی ہے، ہندوازم کو ایک نظریۂ وعقیدہ کے بجائے قومی ثقافت کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے، اسکولوں میں دیویوں، دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں، ہندو مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے اور انھیں شریک کیا جاتا ہے اور ہمارے مسلمان نوجوان دیوالی اور ہولی میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہورہے ہیں، مَردوں اور عورتوں کے لیے دھوتی نما پائجامہ بنائے جارہے ہیں، بہت سے علاقوں میں مسلمان عورتیں ہندوانہ رسم ورواج کے مطابق سِندُور لگاتی، یا کالی پوت کے ہار پہنتی ہیں، بین مذہبی شادی بیاہ کا رواج بھی بڑھ رہا ہے، بعض جگہ مسلمان بچوں کے ہندی نام بھی رکھے جارہے ہیں، ٹی وی پروگراموں کا ہندوکرن کیا جارہا ہے اور ہندو دیوتاؤں اور فرمانرواؤں کو قومی ہیروز کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جو ہمارے سماج میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی ہیں، آج ہم ان کے قدموں کی آہٹ سننے سے قاصر ہیں؛ لیکن اگر ہم نے حالات کو محسوس نہیں کیا تو مستقبل میں اس سے ناقابلِ تلافی نقصان کا اندیشہ ہے؛ اِس لیے اس وقت اس تہذیبی ارتداد کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے کہ یہ محض سیاسی وثقافتی مسئلہ نہیں؛ بلکہ اپنے دُوررَس اثرات کے اعتبار سے ہمارے ملی بقا اور دینی تحفظ کا مسئلہ ہے۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

جلتا نہیں ہے خود سے دِیا احتساب کر

ازقلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

اصلاحِ معاشرہ کا عنوان بہت ہی معروف ہے، اس عنوان کے تحت مختلف شکلوں میں دینی واصلاحی جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اصلاح کا آغاز اپنی ذات سے ہونا چاہیے، آج یہ مزاج عام ہے کہ جب کبھی اصلاحِ معاشرہ کا عنوان سامنے آتی ہے تو لوگوں کی نگاہیں دوسروں پر مرکوز ہوجاتی ہیں، اگر کسی جلسے میں کسی معاشرتی بُرائی یا اخلاقی خرابی کے متعلق کوئی بات کہی جاتی ہے تو سامعین بجائے اس کے کہ اپنے اُوپر غور کریں وہ دوسروں کے تعلق سے سوچنے لگ جاتے ہیں کہ فلاں شخص اگر اس وقت جلسہ گاہ میں موجود ہوتا تو اچھا ہوتا؛ اِس لیے کہ اس کے اندر یہ بُرائی اور خرابی موجود ہے، سوچنے کا یہ انداز معاشرے کی اصلاح اور اصلاحی کوششوں کی کامیابی میں بڑی رکاوٹ ہے۔

اس کے برعکس اگر معاشرے کا ہر فرد اپنی زندگی کا محاسبہ کرے اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کہ میں کس بُرائی میں مبتلا ہوں اور کون سی خامی میرے اخلاق اور کردار میں پائی جاتی ہے، اور پھر اس خامی اور بُرائی کو دُور کرنے کی کوشش بھی کرے تو یقیناً معاشرے کی اصلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ﴾ (اے ایمان والو! تم پر اپنے آپ کی فکر ضروری ہے)۔

ابنِ صمہ نامی ایک بزرگ گزرے ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ اپنی زندگی کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ:

> ''میری عمر ساٹھ سال ہے اور ساٹھ سالوں میں اکیس ہزار پانچ سو دن ہوتے ہیں، اگر ایک دن میں محض ایک گناہ کا ارتکاب ہوا ہو تو اکیس ہزار پانچ سو گناہوں کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے، ان گناہوں کے ساتھ میں اپنے پروردگار سے کیسے ملاقات کروں گا اور کیا جواب دوں گا؟''

یہ سوچتے ہی ان کے دل میں پر غیر معمولی اثر ہوا؛ چنانچہ اسی وقت گرے اور انتقال کر گئے۔ لوگوں نے سنا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ: ''اس شخص نے جنت کی جانب کیا خوب چھلانگ لگائی ہے''۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ساٹھ سالہ زندگی میں یومیہ صرف ایک گناہ شمار کیا جائے تو اکیس ہزار پانچ سو گناہوں کا انبار لگ جاتا ہے، اب تو حال یہ ہے کہ روزانہ دن اور رات میں سینکڑوں گناہوں کا علی الاعلان

ارتکاب کیا جارہا ہے، گناہ کرتے کرتے نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب بہت سارے گناہوں کو گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ گناہوں پر نکیر کرنے اور ان کو روکنے کی کوششیں بھی کمزور پڑتی جارہی ہیں۔ غور کر لیجیے کہ جب زندگی کی شام ہوگی اور ایک انسان ۶۰، ۷۰ رسال کی زندگی گزار کر بغیر توبہ کیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگا تو گناہوں کا کیسا غیر معمولی بوجھ اس کے کاندھوں پر ہوگا اور آخرت میں ان گناہوں کے تعلق سے جواب دہی کس قدر مشکل ہوگی! ابھی وقت ہے کہ اپنی زندگی کا محاسبہ کر لیا جائے اور اصلاح و درستگی کا آغاز خود اپنی ذات سے کیا جائے، خدا کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں پر آنسو بہایا جائے اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اس کو راضی کرنے کی کوشش کی جائے۔ گناہوں کے وبال سے بچنے اور اپنی اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ معاشرے کا ہر فرد آج معاشرے کی اصلاح و درستگی کا متمنی ہے، یہ تمنا بھی اسی راستے سے پوری ہوسکتی ہے۔

آیئے! اصلاح و درستگی کا پہلا قدم خود آگے بڑھائیں اور توبہ کا چراغ جلا کر گناہوں اور بُرائیوں کی تاریکیوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ؎

کیوں ہر طرف تو خوار ہوا احتساب کر
ناراض کیوں ہے تجھ سے خدا احتساب کر

حاصل تو ہوگئیں تجھے ساری سہولتیں
رزقِ حلال کتنا ملا احتساب کر

کب تک رہے گا روشنی کے انتظار میں
جلتا نہیں ہے خود سے دِیا احتساب کر

گمنام ہوگیا ہے تو اپنی ہی بزم میں
کن غلطیوں کی ہے یہ سزا احتساب کر

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط دوم)

طلبۂ عزیز سے صاف صاف باتیں

ازقلم: مولانا محمد اویس صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور

نظام کے پابند رہیں

تعلیم وتربیت دونوں آپس میں وفادار دوست ہیں، ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا، ان میں تلازم ہے، جہاں حقیقی تعلیم ہوگی وہاں تربیت کا ترتب بھی ہوگا اور جو بھی تربیت یافتہ ہیں انھیں علم صحیح کا ثمرہ ملا ہے، صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعین اور ہمارے اکابر کی زندگیاں اس کی واضح مثال ہیں، یہ حضرات علیم یافتہ بھی تھے اور تربیت یافتہ بھی تھے، مدرس کی بنیاد بھی اسی مقصد کے تحت رکھی گئی ہے کہ درسیات کے ذریعہ تعلیم کا حق ادا ہو اور دارالاقامہ کے ذریعہ اس علم پر عمل کی عملی مشق ہو، جس کو تربیت کہتے ہیں؛ اِس لیے طلبہ دونوں نظام کے معاون بنیں، اور نظام کے پابند رہیں، نظامِ تعلیم وتربیت کی پابندی ہی کی وجہ سے آپ طالبِ علم کہلاتے ہیں، اسی میں آپ کا تحفظ بھی ہے اور آپ کی ترقی مضمر ہے۔

اساتذہ کا ادب کریں

ماں باپ کے بعد جس ہستی کا مقام اُونچا ہے وہ اساتذہ ہیں، جی ہاں! اساتذہ ہی الف با سے روشناس کراتے ہیں، زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتے ہیں، وہی تکلیف کے وقت ڈھارس باندھتے ہیں، غم کی دوا بتاتے ہیں، ان سے محبت اور ان کا ادب اور ان کی تعظیم ترقی کے زینے ہیں، ان کی لاڈ پیار مٹھائی ہے، تو ان کی ڈانٹ اور مار پیٹ مرہم ہے، حقیقی طالبِ علم اور مخلص شاگرد استاد کے ایک لمحہ کی بے توجہی اور ناراضگی کو بھی ہرگز برداشت نہیں کرتا اور نہ ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے اور نہ ہی ان کی ناراضگی سے ناراض ہوکر کسی دوسرے استاد یا مہتمم سے ان کی چغلی کھاتا ہے؛ بلکہ اوّل وقت میں اس استاد کو راضی کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے، جب تک استاد راضی نہ ہوجائے وہ اپنے آپ کو ﴿وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ کا مصداق سمجھنے لگتا ہے، اور جو طالبِ علم مخلص نہیں ہوتا اور اپنے استاد کا عاشق نہیں ہوتا وہ اپنے استاد کی ذرا بے توجہی سے خود کو اس

سے بے نیاز کر لیتا ہے،ضرورت پڑنے پر گستاخی کرنے سے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ چغلی کھانے سے دریغ نہیں کرتا، اس سے راقم الحروف کو واسطہ پڑا ہے؛ چنانچہ جس ادارہ میں یہ عاجز پڑھاتا ہے وہاں ایک درس گاہ کے دو تین طلبہ نے بے اُصولی کی، یہ عاجز اس سے دل برداشتہ ہوا، ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے نظریں نیچی رکھ کر سبق پڑھانے لگا، واللہ تحقیر یا تذلیل پیشِ نظر نہیں تھی، میں کیا میری حقیقت کیا، بس ان کو احساس دلانا اور غلطی پر تنبیہ کرنا مقصد تھا، اُن دو تین طلبہ نے معافی مانگنے کے بجائے بالواسطہ یا بلاواسطہ مہتمم صاحب کی خدمت میں یہ شکایت پہنچائی، بالفاظِ دیگر چغلی کی کہ حضرت ہمیں دیکھ کر نہیں پڑھاتے، نظریں نیچی رکھ کر پڑھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اس بات سے مہتمم صاحب مجھ پر ناراض ہوئے؛ لیکن (اللہ جزائے خیر دے مہتمم صاحب کو، کہ وہ شروع دن سے میرا لحاظ کرتے چلے آئے ہیں) انھوں نے مجھ سے براہِ راست اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا؛ بلکہ کسی اور سے اس کا اظہار فرمایا، ہاں! براہِ راست مجھ سے حقیقت معلوم کر لیتے تو بہتر ہوتا؛ تاکہ آئندہ ایسے فتنہ پرداز، چغل خور کو اس طرح الزام تراشی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ بہر حال الخیر فیما وقع، مجھے دُکھ اِس بات کا ہے کہ اگر طلبہ نے شکایت پہنچائی تو سوال یہ ہے کہ کیا استاد کو ناراض ہونے کا، تنبیہ کرنے کا کوئی حق نہیں، استاد ناراض ہوتا ہے تو اس کو منانا چاہیے یا اس کی چغلی کھانی چاہیے یا کسی اور نے اپنے مفاد کے لیے چغلی کی تو اس کا معاملہ مَیں میرے اللہ کے حوالہ کرتا ہوں اور اِس آیت ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں، وإلى الله المشكتي.

ہمارے اکابر کا نام ہم بڑے ہی عقیدت سے لیتے ہیں، ان کی خدمات مسلم اور ان کے علوم ومعارف مبرہن، وہ ترقی کے منتہی کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کے اسباب بے شمار ہیں، انہیں میں ناقابلِ فراموش سبب ان کا اپنے اساتذہ سے عشق کے درجہ میں تعلق اور والہانہ ادب واحترام بھی ہے، اگر ان کو زیرِ قرطاس لایا جائے تو ایک دفتر چاہیے، ایک واقعہ بطور نمونہ پیش ہے، حضرت علی میاں ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

''میرے انگریزی کے استاد خلیل الدین صاحب ہنسوی نے جن کا عرب صاحب بڑا لحاظ کرتے تھے، ان سے میرے ایسے طرزِ عمل کی شکایت کی جس سے ان کو اپنی اہانت کا احساس ہوا تھا، یہ احساس محض غلط فہمی پر مبنی تھا کہ میں نے یہ کہنے کے بعد کہ فلاں عذر کی وجہ سے میرے لیے سبق پڑھنا مشکل ہے، دروازہ ذرا زور سے بند کیا، عرب صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے بھائی صاحب سے اجازت لی کہ آج وہ میری اچھی طرح تنبیہ کریں گے، ان کے مزاج میں قدرے حدت بھی تھی، اس واقعہ نے ان کو مشتعل کر دیا، انھوں نے مجھے اس پر بہت زدوکوب کیا، جو اس جرم

اور واقعہ کی نوعیت سں بڑھ کر تھا، بعد میں ان کو احساس ہوا کہ اس میں کچھ بے اعتدالی ہوگئی، جس کے لیے مجھ سے معذرت بھی کی، شدہ شدہ یہ خبر والدہ صاحبہ کو رائے بریلی پہنچی، انھوں نے مجھ سے دریافت کیا، اور کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ عرب صاحب نے تم کو بہت مارا، اللہ تعالیٰ نے اس وقت توفیق دی، اور میں نے عرب صاحب کی پوری وکالت اور ان کی طرف سے مدافعت کی اور ان کو اس تنبیہ وتادیب میں بالکل حق بجانب قرار دیا، والدصاحبہ مطمئن ہوگئیں اور میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس سعادت مندانہ رویہ نے جو محض توفیقِ الٰہی کا نتیجہ تھا، مستقبل میں میرے لیے عربی زبان اور ادب کا ذوق پیدا ہونے اور اس کے ذریعہ دین وعلم کی خدمت کرنے کا فیصلہ کردیا، اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور میں اپنے کو بَری اور مظلوم قرار دیتا، اور اپنے محسن ومربی استاد کو حدود سے تجاوز کرنے والا قرار دیتا، تو شاید معاملہ برعکس ہوتا اور میں ہمیشہ کے لیے ان کے فیضِ تعلیم اور عربی مبان وادب میں کامیابی سے محروم کردیا جاتا، ﴿ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ﴾''۔ (کاروانِ زندگی: ج۱،ص۹۱)

مطالعہ کا ذوق پیدا کریں

''وخير جليس في الزمان كتاب'' کہ زمانہ میں بہترین ہم نشین کتاب ہے، کتاب سے حد درجہ عقیدت، اُن کو جمع کرنے کا شوق، اپنے ذاتی کتب خانے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی جستجو اہلِ ذوق میں نمایاں رہی ہے، اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس سلسلے میں وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے؛ چنانچہ چھٹی صدی کے ایک حنبلی عالم امام ابن الخشاب کے بارے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ موصوف نے ایک دن کتاب ۵۰۰؍درہم میں خریدی، قیمت ادا کرنے کے لیے کوئی چیز نہ تھی؛ لہٰذا تین دن کی مہلت طلب کی اور مکان کی چھت پر کھڑے ہوکر مکان بیچنے کا اعلان کیا، اس طرح اپنے شوق کی تکمیل کی۔ (ذیل طبقات الحنابلہ:۲؍۲۵۱) مسلمانوں میں کتب خانوں کی اہمیت اس حد تک تھی کہ کتابوں کا وجود رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا سبب بن گیا تھا، لڑکیوں کے جہیز میں کتب خانے دیے جاتے تھے، گویا نکاح شرعی اور سماجی ضرورت کے ساتھ علمی ضرورت بھی بن گیا تھا؛ چنانچہ:

امام اسحاق بن راہویہؒ نے سلیمان بن عبداللہ زغندانیؒ کی بیٹی سے شادی اِس لیے کی تھی کہ اس سے انھیں امام شافعیؒ کی جملہ تصانیف پر مشتمل کتب خانہ مل جاتا تھا۔ (انساب للسمعانی:۶؍۳۰۶)

کتابوں کے مطالعہ میں بے شمار فوائد ہیں، من جملہ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کتابوں کا بکثرت مطالعہ سے قوتِ حافظہ کو تقویت ملتی ہے؛ چنانچہ:

امامِ بخاری رحمہ اللہ سے حافظہ کی دوا کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمانے لگے: "**لا أعلم شيئًا أنفع للحفظ من نهمة الرجل ومداومته النظر**". (سیر أعلام النبلاء للذہبیؒ: ۱۲/۴۰۶) کہ حافظہ کے لیے آدمی کے انہماک، دائمی نظر ومطالعہ سے بہتر کوئی چیز میرے علم میں نہیں۔

کتب بینی ہی علم میں ترقی کا واحد ذریعہ ہے، علم کا بقا مطالعہ پر موقوف ہے، علم دوست کے لیے مطالعہ ایک خیر خواہ رفیق سفر وحضر ہے، جنھوں نے کتابوں سے زیادہ استفادہ کیا وہ علم سے خوب لطف اندوز ہوئے اور ان کا پائیدار رہا اور ان کا نام وتذکرہ کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔

کسی ایک فن میں اختصاص پیدا کریں

یہ زمانہ بہت حساس اور زمانے والے بہت زیرک ہیں، نہ زمانہ کسی کو آسانی سے قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ ہی زمانے والے کسی کو ہضم کرنے پر راضی ہیں، جب تک کہ کسی فن میں اختصاص کی شان نہ دیکھیں لیں؛ اِس لیے کسی بھی فن میں اختصاص پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ملتِ اسلامیہ کے سامنے اپنی ضرورت کو منوائیں، اپنی قابلیت کے ذریعہ یہ باور کرائیں کہ میں اور میرے پاس موجود علمِ دین کی ضرورت امت کو کس حد تک ہے، میں ایک ضرورت ہوں، ملت کے کاندھے کا بوجھ نہیں ہوں، جس کو اُتار پھینکنے کی فکر امت کے افراد کو دامن گیر ہو، اس پُرفتن دَور میں بے شمار چیلنجز کا سمنا کرنا پڑے گا، ضرورت پڑنے پر کفر واسلام کے بیچ ہم کو ایک آہنی دیوار بننا پڑے گا، درد والم میں گھرے لوگوں کے لیے ہمارے علم کو مرہم اور ہمیں مسیحا بننا پڑے گا، ماحول کے زہریلے اثرات کے لیے ہمارے تقویٰ وطہارت کی زندگی کو تریاق بننا پڑے گا، خلوت میں بیٹھ کر ذرا ہم ایمانداری سے محاسبہ کریں کہ کیا ہم اس کے لیے مستعد ہیں؟ کیا ہم امت کے خوابوں کی تعبیر بن سکتے ہیں؟

حضرت علی میاں ندوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ فرمایا کہ:

"زمانہ ایسا حقیقت پسند، ایسا بے مروت، اتنا غیر جانب دار ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ میں کوئی نئی چیز نہ دی جائے اور اس کی گردن کو کسی بوجھ سے بوجھل نہ کدیا جائے کہ وہ جھکنے پر مجبور ہو جائے، اس وقت تک وہ جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، زمانہ سے کسی قسم کا اقرار کرالینا، کسی قسم کی سند حاصل کرنا، کوئی تمغۂ امتیاز یا خراجِ عقیدت حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے، اور محض روایت پرستی اس

کے لیے کافی نہیں ہے، زمانہ کو اعتراف کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اپنی وقیت کا نقش قائم کرنے کے لیے، اپنے دلوں اور دماغوں میں پیدا کرنے کے لیے، اپنے لیے مناسب اور شایانِ شان مقام حاصل کرنے کے لیے، آپ کو بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی، آپ کو اپنا معیار بلند کرنا پڑے گا، اس زمانہ میں اگرچہ علم نے بڑی ترقی کی ہے، اور اس میں بہت سے نئے میدان پیدا ہوگئے ہیں اور اس کی اہمیت ووسعت میں برابر اضافہ ہورہا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ علمی زندگی کی مشکلات کچھ ایسی ہیں، زمانہ نے ایسی کروٹ لی ہے اور ایسے انقلابات ملک میں پیش آچکے ہیں کہ اب محض علم کی وسعت، تحریر کی شگفتگی، خیالات کی بلندی اور نظریات کی جدت کافی نہیں ہے، اب اس کے ساتھ بلند کرداری، دردمند پُرسوز دل کی بھی ضرورت ہے''۔ (پاجا سراغِ زندگی: ص/۸۱)

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جنھوں نے اختصاص پیدا کیا، بلند کردار کا مظاہرہ کیا، پُرسوز دل کے ساتھ زندگی گزاری، دینِ اسلام اور شریعتِ محمدیہ کو سب پر ترجیح دی، انھیں سے دین پھیلا اور پھولا ہے، ان کے سامنے فتنوں کو زیر ہونا پڑا ہے، ایسی پاکباز شخصیات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں؛ چنانچہ پہلے اس ملک میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ یا سیّد علی ہمدانی کشمیری رحمہ اللہ جیسا ایک فقیر بےنوا آتا ہے اور پورے کے پورے ملک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے بھر دیتا ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے حکومتِ مغلیہ میں انقلاب برپا کردیا، انھیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگ زیب جیسے فقیہ ومتشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس طویل وعریض ملک کا رجحان بدل دیا اور پورے نظامِ فکر اور نظامِ تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہا اللہ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دَور میں اتنا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کردیا اور علومِ شریعت کو ایک نئی زندگی بخش دی، ابھی پچھلے عرصہ میں مولانا محمد الیاس صاحب نے ایمان اور دینی جدوجہد کی ایک نئی روح پھونک دی، غرض ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

آج ہمارے فضلاء اس روح سے خالی، ان کیفیات سے عاری اور اس قوت سے محروم ہیں، جو لوگوں کو نئے سرے سے سوچنے اور بدل جانے پر مجبور کردیتی تھی، زمانہ بڑا حقیقت شناس ہے، وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ، بلند دماغ کے سامنے جھکتے ہیں اور خالی اور سرد دل معمور اور گرم دل کا لوہا مانتے ہیں، ہمارے مدارس میں دماغی انحطاط بھی روزافزوں ہے، اور قلبی افسردگی بھی روبہ ترقی، مقررین اور واعظین کی اب بھی کمی نہیں؛ مگر بقول حضرت جگرؒ ع ''آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں''۔ (پاجا سراغِ زندگی: ص/۸۵)

گناہوں سے بچیں

علم کے ذرائع (قلب، عقل، آنک، کان اور زبان) کی حد درجہ حفاظت کا اہتمام کریں، قلب غیر اللہ میں مشغول نہ ہو؛ کیونکہ قلب میں غیر اللہ کی محبت رہے گی، اس دل میں اللہ کی محبت اور معرفت نہیں ہوگی، عقل خواہشات کی آماج گاہ نہ ہو؛ کیونکہ اگر ہر وقت خواہشات پوری کرنے کی فکر میں لگے گا تو وہ عقل علم محفوظ رکھنے کی صلاحیت کھودے گی، بدنگاہی سے آنکھ کی حفاظت ہو؛ کیونکہ یہ بیماری ایسی سنگین ہے کہ اس سے باطن ستیاناس ہوجاتا ہے اور غیبت اور گانوں سے کان محفوظ رہے؛ کیونکہ گانا نفاق پیدا کرتا ہے؛ چنانچہ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: اَلْغِنَاءُ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ. (سنن ابی داؤد: ۴۹۲۷) اور غیبت کی شناعت مسلم ہے؛ چنانچہ ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحجرات: ۱۲) گالی، بسیار گوئی، لایعنی باتوں سے اور چغلی سے اور طعن وتشنیع سے زبان کو پاک رکھنے کا پورا پورا اہتمام ہو؛ کیونکہ گالی کو فسوق کہا گیا؛ چنانچہ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ". (متفق علیہ) بسیار گوئی سے حکمت کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے بے شمار آفتیں آپڑتی ہیں؛ چنانچہ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ". (رواہ البخاری ومسلم) اور ترکِ لایعنی کو اسلام کی خوبی کہا گیا ہے؛ چنانچہ: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَايَعْنِيْهِ". رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ حَسَنٌ. چغل خور کا جنت میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ: كُنَّا جُلُوْسًا مَعَ حُذَيْفَةَ فِي الْمَسْجِدِ، فَجَاءَ رَجُلٌ حَتّٰى جَلَسَ إِلَيْنَا فَقِيْلَ لِحُذَيْفَةَ: إِنَّ هٰذَا يَرْفَعُ إِلَى السُّلْطَانِ أَشْيَاءَ فَقَالَ حُذَيْفَةُ إِرَادَةَ أَنْ يُسْمِعَهُ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ. (مسلم: ج۱) اور یہ ایسا مہلک مرض ہے کہ طالبِ علمی کے زمانہ میں اگر یہ جڑ پکڑ لے تو فارغ ہونے کے بعد بھی محض صدر، سکریٹری اور متولی کا قرب حاصل کرنے کے لیے امام ہے، تو مؤذن کی، اور مؤذن ہے تو امام کی چغلی کھاتا ہے اور اگر کسی ادارہ کا مدرس ہے تو ناظم مدرسہ کی نزدیکی حاصل کرنے کے لیے اساتذہ کی چغلی کھاتا ہے، بے بنیاد باتیں اپنے ہم منصب اساتذہ کی طرف

منسوب کرتا ہے؛ حالانکہ کسی کا بھی ناحق قرب کارآمد نہیں ہوتا؛ اِس لیے ہمیشہ ہر آن اللہ جل شانہٗ کے قرب کی جستجو میں لگے رہیں۔

آپ اپنے اندر دینی صلاحیت پیدا کیجیے، آپ کے اندر علماءِ ربانی کے کچھ اوصاف ہوں، آپ کے اندر اس سیرت کی سجھلک ہو جو ان بزرگوں میں تھی، استغناء ہو، توکل ہو، اللہ سے تعلق ہو، آپ کو عبادت میں ذوق آئے، عوام کی سطح سے آپ کی سطح بلند ہو، فن میں کمال کے ساتھ ساتھ تعلق مع اللہ مضبوط ہو جو علماءِ ربانی کا شعار تھا کہ ان کو دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا، ان کے پاس بیٹھنے سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی تھی، دل میں گداز اور حرارت پیدا ہوتی تھی اور خدا کی محبت جوش مارتی تھی۔

دین کی خدمت پیشِ نظر رہے

علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل کرنا یہ علم کی تکمیل ہے، اس کی نشر واشاعت کرنا یہ اس کا حق ہے؛ چنانچہ "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ" (بخاری) (یعنی تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے) اس حدیث شریف میں پڑھنے والے کے ساتھ ساتھ پڑھانے والے کے لیے خیریت کی بشارت دی گئی ہے، پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا سلسلہ جب سے چلا علم سے ایک مخلوق نے فائدہ اُٹھایا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیث پاک "فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" (بخاری) (یعنی میری اس مجلس کے حاضرین غائبین تک پہنچادیں) نیز "بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً" (بخاری) (یعنی میرا پیغام پہنچادو چاہے وہ ایک ہی بات کیوں نہ ہوں) کی مکمل تابعداری فرمائی، جس کے نتیجہ میں علم سارے عالم میں پھیلا، علم پر عمل کرنے والے خدا ترس بندے وجود میں آئے؛ اِس لیے طلبہ عزیز! طالبِ علمی کے زمانہ ہی سے نیت رکھیں کہ ٹھوس علم حاصل کر کے تقدس کی زندگی گزارتے ہوئے نیک نیتی کے ساتھ صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور آخرت کی سرخروئی کے لیے دین کی خدمت کریں گے، چاہے امامت وخطابت ملے، چاہے صباحی ومسائی مکتب کی ذمہ داری ملے، چاہے منصبِ تدریس پر فائم ہوں، چاہے ملی وسماجی حدمات پر مامور ہوں، چاہے دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے کا موقع ملے، جو ذمہ داری ملے اس کا حق ادا کرنے والے بنیں۔

چند گزارشات

طلبہ عزیز! آنے والے پُرتن کٹھن دَور کے لیے بہت کچھ مل بیٹھ کر ہم سب کو تیار ہونے کی ضرورت ہے،

ذہنی وفکری طور پر بھی، جسمانی اور روحانی طور پر بھی ہمیں بہت زیادہ مستعد رہنے کی ضرورت ہے، جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں یہ دجالی دَور، قربِ قیامت کا دَور ہے، اسلام اور اس کی تعلیمات ہی کے ذریعہ ہم مامون ومحفوظ رہ سکتے ہیں، دعوت اور تعلیم ہی کے ذریعے ہمارا اور ہماری نسل کا دین محفوظ رہ سکتا ہے؛ اِس لیے:

(۱) عربی، اُردو اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کریں؛ کیونکہ جس علاقے میں مسلمان مقامی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، وہاں وہ مسلمان محفوظ نظر آرہے ہیں، آپ ازخود اس کا جائزہ لے لیں۔

(۲) لازماً کوئی ہنر سیکھیں؛ تاکہ بوقت ضرورت کارآمد ہو، بے شمار اشخاص نے ہنر سیکھا آج تک ان کا نام وکارنامہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، سلطان عبدالحمید بڑھئی تھے، سلطان سلیمان زیورات بناتے تھے، اورنگزیب بادشاہ قرآن مجید لکھتے تھے اور ٹوپیاں بناتے تھے۔ ماضی کا مسلمان تعلیمی نظام کے ساتھ ہنر بھی سیکھتا تھا اور اپنے سے کام کرتا تھا۔

(۳) جسمانی طور پر بھی ہمیں تیار ہونے کی ضرورت ہے، ورزش کریں اور بدن تھکانے دینے والے کھیل کھیلیں، سکاؤٹ میں حصہ لیں اور جنگل میں خیمہ لگانا، آگ جلانا، کھانا پکانا سیکھیں۔

(۴) روحانیت کو مزین ومزکی کرنے کی !! کوشش کریں، اس کے لیے کسی اللہ والے سے منسلک ہوجائیں، اطلاع، اتباع، انقیاد کے راستہ سے اپنے قلب کی اصلاح کریں۔ ؎

قال را بگذار مردے حال شو ❖ پیش مردے کاملے پامال شو

یہ چند سطور ہیں، ان پر عمل کی کوشش کریں، اللہ کی ضمانت ہے کچھ دن تم محنت کرلو، سعید، ہونہار، محنتی، جفاکش طالبِ علم بن جاؤ، اپنے اندر اخلاص پیدا کرلو اور پھر اللہ کی قدرت رحمت کا تماشا دیکھو۔

وَمَاتَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ حَسْبِيْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

غزوۂ تبوک میں پنہاں تربیتی پہلو

ازقلم: مولانا محمد طیب حنیف سلّمہٗ، متعلّم دَورہ حدیث جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن

رجب کا واقعہ ہے، جس میں مسلمانوں کے خلاف بالمقابل مشرکینِ عرب و یہود سے زیادہ سخت وجنگجو رومن امپائر کی فوج برسرِ پیکار ہوئی، جنہیں نصف دنیا پر حکمرانیت کا طُرّۂ امتیاز حاصل تھا، جس کی مسلح افواج نے حال ہی میں سلطنتِ ایران کو شکستِ فاش کیا تھا، جن کی وسعتِ مالی، قوتِ بدنی وعسکری نظام وغیرہ کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کی حالت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک پرکاہ کا کوہ سے مقابلہ ہے، علاوہ ازیں عرب عیسائی قبائل لخم، جزام، عاملہ، قبیلہ غسان وغیرہ بھی مقامِ موتہ پر ہونے والی شکستِ فاش کا بدلہ وانتقام لینے کے واسطے بے چین وبے تاب ان کے شانہ بشانہ شریک تھے۔

اس کے بالمقابل مسلمانوں کی زبوں حالی کا کچھ یوں حال تھا، جس کی تفصیل سے متعلق مشہور مؤرخ ابنِ اسحاقؒ رقم طراز ہیں:

"أنّ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم أمر أصحابه بالتهيؤ لغزو الروم، وذٰلک في زمان من عسرة الناس، وشدّة من الحرّ، وجدب من البلاد، وحين طابت الأثمار، والناس يحبون المُقام في ثمارهم وظلالهم، ويكرهون الشخصوص على الحال من الزمان الذين هم عليه، وكان رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم قلما يخرج في غزوة إلا كنى بها، وأخبر أنه يريد غير الوجه الذي يصمد له إلا ماكان من غزوة تبوک فإنه بيّنها الناس؛ لبعد الشقة وشدة الزمان وكثرة العدو الذي يصمد له لتأهب الناس لذٰلک أهبته". (سيرت ابنِ هشام: ٥١٦/٢، شركة مكتبة مطبعة، مصطفى اليلبي الحلبي)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثار صحابہؓ کو رومیوں کے خلاف جنگ کی تیاری کا حکم دیا، یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگ کسمپرسی کی حالت میں، سخت گرمی، قحط سالی کا شکار تھے، جب کہ مدینہ کے نخلستان میں کھجوریں پک رہی تھیں (جس کا سالہا سال شدّت سے انتظار رہتا تھا)، جس پر اُگنے والی کھجوروں اور ان کے زیرِ سایہ بیٹھنے کو ہر چیز سے محبوب جانا جاتا تھا؛ نیز ان پیش آمدہ حالت

میں خود کو دھکیلنا طبیعت پر شاق وگراں معلوم ہوتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جس سمت سے جہاد پر روانگی کا قصد فرماتے اس کو عام لوگوں پر مخفی رکھتے، اور اس کے خلاف جہت کو (توریۃ) بیان فرماتے تھے؛ مگر غزوۂ تبوک وہ واحد معرکہ تھا کہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافت کی دُوری، حالات کی سختی اور فریقِ مخالف کی کثرتِ تعداد کے سبب لوگوں کو صراحتاً سمتِ سفر سے آگاہ کیا؛ تاکہ لوگ حسبِ حالت زادِ راہ تیار کرلیں"۔

اس معرکہ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جاں نثاری واخوتِ اسلامی کے اُن گراں قدر جذبات کا اظہار کیا کہ اوراقِ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے؛ نیز اس میں تاقیامت کے انسانوں کے واسطے مختلف حیثیتوں سے تربیتی پہلو نمایاں ہوتے ہیں، جس کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے انسان دینی ودنیاوی ہر اعتبار سے ترقی کی منازل بآسانی طے کرسکتا ہے، جن میں سے چند فوائد ہدیۂ قارئین پیش ہیں:

راہِ خدا میں جانی ومالی قربانیاں پیش کرنے کا جذبہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نفیر عام کا حکم دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صدا پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی تعداد کا ضروریاتِ زندگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جہاد کے لیے نکلنا ان کے پاک طینت ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

نیز اس کسمپرسی کی کیفیت اور مسلمانوں کی شکستہ حالی کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چام چندہ کا اعلان کیا اور اس میں صدقہ خیرات کی ترغیبی مہم چلائی، جس پر شمع رسالت کے پروانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس میں حضرت ذوالنورین عثمان غنی رضی اللہ عنہ اونٹ، گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کرکے "**مجھز جیش العسرۃ**" کے لقب سے سرفراز ہوئے، جبکہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ چالیس ہزار درہم راہِ خدا میں صرف کرکے مستحق اجر ہوئے۔ (سیرت ابنِ ہشام: ۵۱۸/۲، شرکۃ مکتبۃ مطبعۃ، مصطفیٰ البابی الحلبی)

نیکی کے کاموں میں منافست ومسابقت مطلوب ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ملتا ہے کہ میں نے سوچا کہ آج کے دن تو میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے بازی مار سکتا ہوں؛ چوں کہ میری مالی حالت ان سے قدرے خوش حال ہے، اس بنا پر وہ اثاث البیت کا نصف جو ڈھائی ہزار روپیہ پر مشتمل تھا پیشِ خدمت کیا؛ مگر قربان جائیں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری پر، جنھوں نے گھر میں اللہ اور رسول کی محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہ چھوڑا، گھر میں جو کچھ تھا سب خدا کے نام پر نثار

کردیا۔ جب یہ منظر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا تو فرمایا کہ مجھے معلوم ہوگیا کہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کبھی بازی نہیں جیت سکتا۔

(حیاۃ الصحابہ:۱۵/۲،انفاق الصحابة المال في غزوة تبوك :۱۵/۲،مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع)

تعداد کی قلت وکثرت پر اعتماد غرِ شیطانی ہے:

رومن امپائر افواج کی تعداد تقریباً...... تھی، جبکہ اس کے بالمقابل مسلمانوں کا تیس ہزار کالشکر ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ کا والہانہ نعرہ بلند کیے عشقِ نبویؐ سے سرشار وادیوں وبستیوں کو قطع کیے جارہا تھا۔

عذرتراشی جرم میں اضافہ کا باعث ہے ء

مسلمانوں کے ہمراہ منافقین کی ایک بڑی تعداد اس سفر میں شریک ہوئی؛ مگر ان کی ایک جماعت نے مدینہ ہی میں تراشیدہ اعذار کے انبار لگا کر رخصت کا سوال کیا، جیسا کہ منافق جد بن قیس نے یہ عذر گڑھا کہ میں نہایت حسین وجمیل ہوں، بنو اصفر کی خواتین کو دیکھ کر نفس پر قابو نہیں پا سکتا؛ لہٰذا اس ابتلاء وفتنہ سے مجھے محفوظ رکھیں، جس کی شناعت وفتنہ میں پڑ جانے کو قرآنِ مجید نے یوں آشکارا کیا: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَاتَفْتِنِّيْ اَلَافِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (تفسیر قرطبی: ۱۵۸/۸، ط: دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ۔ سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۴۹) اس کے علاوہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی سلول اور اس کے ہمنوا وہم مشرب افراد مدینہ کے قریب ذُباب پہاڑی تک شریک ہوئے اور پھر موقعہ کو غنیمت جانے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اجتماعی اُمورِ دین میں رخنہ ورکاوٹ ڈالنے پر سخت تنبیہ:

منافقین کی ایک بڑی تعداد ٹڈی دل ہونے کی وجہ سے خود تو شرکت سے باز رہی، جبکہ سویلم یہودی کے گھر جمع ہو کر سادہ لوح مسلمانوں کو جہاد جیسے عظیم امر سے روکنے کی مہم کا آغاز کیا، اور قسمہا قسم کے حربوں کو استعمال کیا، اس کو عملی جامہ پہنایا، جیسا کہ قرآنِ مجید نے ان کا جملہ حکایۃً نقل کرکے ان کو سخت ڈانٹ پلائی: ﴿وَقَالُوْا لَاتَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۸۱)

جب اس بات کی اطلاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو بھیج کر اس یہودی کے گھر کو نذرِ آتش کرنے کا حکم دیا۔ (سیرت ابنِ ہشام: ۵۱۷/۲، شرکۃ مکتبۃ مطبعۃ، مصطفیٰ البابی الحلبی)

ایک دوسرے کے ساتھ احسان و مالی تعاون:

ایک طرف تو منافقین مختلف اعذار تراش کیے اپنے تئیں خود کو جنگی صعوبتوں سے باز رکھ کر دانشمند ہونے پر خوشی ومسرت سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے، تو دوسری جانب مالی اعتبار سے پسپا حال مسلمانوں کی ایک جماعت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اشکبار حال میں حاضر خدمت ہوئی، جس کا نقشہ قرآن مجید نے یوں کھینچا ہے:

﴿وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ، تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۹۲)

ترجمہ: اور نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس اس غرض سے آئے کہ تم انہیں کوئی سواری مہیا کر دو، اور تم نے کہا کہ: میرے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کر سکوں، تو وہ اس حالت میں واپس گئے کہ ان کی آنکھیں اس غم میں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے بھی سواری وزادِراہ کا انتظام نہ ہو سکا تو ان حضرات کا نہایت افسردگی کے عالم میں حضرت ابنِ یامین بن عمیر رضی اللہ عنہ پر گزر ہوا، ان سے رونے کی وجہ معلوم ہونے پر انہوں نے سواری کے واسطے اُونٹ اور زادِراہ کے لیے کھجوریں فراہم کر کے امت کو ہمدردی کے جذبات کا منہ بولتا ثبوت دیا۔ (سیرت ابنِ ہشام: ۵۱۸/۲، شرکۃ مکتبۃ مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی)

سفرِ تبلیغ و جہاد روانگی سے قبل اہل وعیال کے واسطے نیابت کا اہتمام:

یہ پہلا معرکہ تھا جس میں کسی زوجہ محترمہ کو ہمراہ لیے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عازمِ سفر ہوئے، اس بنا پر اہل وعیال کی دیکھ بھالی کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور سفر پر روانہ ہوئے؛ مگر منافقین نے ان کو پست ہمت وابتلاءِ انفاق کے طعنے دیتے ہوئے موردِ الزام ٹھہرایا، جس پر کبیدہ خاطر ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا رختِ سفر باندھا اور مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر مقامِ جُرف پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قافلے سے جا ملے؛ مگر اطلاع ملنے پر آپ نے انہیں دوبارہ لوٹنے کا حکم دیا؛ نیز ارشاد فرمایا:

"أَلَا تَرْضٰى أَنْ تَكُوْنَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ، مِنْ مُوْسٰى إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِيْ".

(صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک، رقم الحدیث ۴۴۱۶)

"کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہیں مجھ سے اس نسبت کا شرف حاصل ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کو

موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے (نسبتِ نیابت کا شرف) حاصل ہوا؟''
یہ سن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ مطمئن ہو کر واپس مدینہ لوٹ آئے۔

عذابِ الٰہی کا مظہر بستیوں پر سے گزرتے ہوئے خشیت کے آثار کا ظہور:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا قافلہ جب مقامِ حِجر کو پہنچا، جہاں قومِ ثمود کے کھنڈرات تھے جو ہزار ہا برس قبل حضرت صالح علیہ السلام نے توحید کی صدا بلند کی تھی؛ مگر ان کی دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے ظلم وتعدی کی داستان رقم کرنے پر حق تعالیٰ شانہٗ نے ان پر زلزلے وکڑک کا عذاب مسلط کر کے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا؛ البتہ پہاڑوں میں تراشیدہ قصر ومحلات زبانِ حال سے ان کی داستانِ عبرت سنا رہے تھے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمائی: ''ان ظالم لوگوں کی آبادی ومسکن سے گزرتے ہوئے حق تعالیٰ سے ڈرو، مبادا یہ کہ وہی عذاب تم پر نازل نہ ہو جائے، کوئی شخص بھی یہاں قیام کی کوشش نہ کرے، یہاں کا پانی استعمال میں نہ لائے اور جو پانی استعمال کر کے آٹا وغیرہ گوندھا گیا ہو اسے جانور کے سامنے ڈال دیا جائے''؛ (صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک، رقم الحدیث ۴۴۱۸) چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عبرت ناک مقام کو چہرہ انور پر رومال ڈالے تیزی سے عبور کیا۔

حساس اور لطیف مزاج انسان کو عذاب مدہ مقامات پر ہزار ہا سال بعد بھی ایک وحشت وغضب اُترتا محسوس ہوتا ہے، حضور علیہ السلام سے بڑھ کر ایسے اثرات کا احساس بھلا کس کو ہو سکتا تھا۔

(تاریخ امتِ مسلمہ: ج ۱، ص ۳۶۴، طباعت شدہ المنہل پبلشر)

غیرتِ شرعی ایمان کا حصہ ہے:

حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ سفر تبوک سے گرمی کی شدت کے پیشِ نظر لوٹ آئے تھے، جب اپنے باغ کے سایہ فگن خیمے میں داخل ہوئے اور اہلیہ کی جانب سے ٹھنڈا پانی پیش کیا گیا تو غیرتِ ایمانی واخوتِ اسلامی نے جوش مارا اور فرمانے لگے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ اور ان کے اصحاب سخت گرمی کی تپش سے دوچار ہوں اور ابوخیثمہ یہاں ٹھنڈی چھاؤں وشیریں پانی سے لطف اندوز ہو، ضمیر نے ایسا جھنجھوڑا کی اسی وقت قسم اُٹھائی کہ اس باغ میں قدم بھی نہ رکھوں گا، حتیٰ کہ دوبارہ ان کے ساتھ شریک نہ ہو جاؤں، بہرحال اسی وقت عازمِ سفر ہوئے اور حاضر خدمت ہوئے، تاخیر کی وجہ دریافت کیے جانے پر سارا ماجرا بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خوب خیر کی دعاؤں سے نوازا۔ (سیرت ابنِ ہشام: ۲/۵۲۱، شرکۃ مکتبۃ مطبعۃ، مصطفیٰ البابی الحلبی)

چھوٹوں کی رائے کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا:

روایت میں آتا ہے کہ سفر کے دَوران بھوک کی شدت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی سواری کے جانور ذبح کر کے کھانے پر مجبور تھے، جب یہ سارا منظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اس عمل سے اصحاب کو روک دیجیے، اِس طرح تو سفر سے واپسی میں شدید دِقّت پیش آئے گی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اس کے علاوہ دوسری راہ کیا ہے؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیرکی ودانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ سب کے پاس موجود زادِراہ جمع فرمالیں، اور آپ اس پر برکت کی دعا کیجیے، اُمید ہیکہ اللہ کی طرف سے راہ ہموار ہوجائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ پسند آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا، تمام صحابہؓ نے اپنے پاس جو تھوڑا بہت محفوظ تھا سب ایک چمڑے کے دسترخوان پر جمع کیا، پھر آپ نے اس پر برکت کی دعا کی، اور فرمایا: ''خُذُوْا فِيْ أَوْعِيَتِكُمْ'' سب اپنے توشہ دان کو مکمل بھرلو، سب نے توشہ دان کو بھرا، پھر آپ نے حکم دیا کہ اب تم لوگ کھاؤ، راوی کہتے ہیں کہ سب نے خوب سیر ہوکر کھایا، حتیٰ کہ بہت سارا کھانا اب بھی باقی رہا، جس پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَايَلْقَى اللّٰهَ بِهِمَا عَبْدٌ غَيْرُ شَاكٍّ فَيحجبَ عَنِ الْجَنَّةِ''.

(دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲۲۹/۵، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

خرقِ عادت اُمور کا ظہور از قبیل ممکنات ہے:

کسی نبی کے ہاتھ پر خرقِ عادت امر کا ظہور معجزہ، جبکہ ولی کے ہاتھ پر وہ کرامت کہلاتا ہے۔ دَورانِ سفر پانی کی قلت وسخت گرمی کے باعث پیاس سے بُرا حال تھا، اثناءِ سفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ہم مقامِ تبوک عین زوال کے وقت پہنچیں گے؛ لیکن یاد رکھنا کہ مجھ سے سبقت کر کے چشمہ سے کوئی شخص پانی استعمال نہ کرے، صحابہؓ نے آپؐ کی بات پر لبیک کہا؛ لیکن چند منافقین نے سبقت کر کے پانی استعمال کیا، جس سے پانی میں گدلا پن آنے لگا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی سے ہاتھ منہ دھوکر دوبارہ اسی میں اُنڈیل دیا، اللہ کی شان اس میں معجزاتی طور پر خوب پانی بھر آیا۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲۳۶/۵، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

مخلص دوست کبھی پیٹھ نہیں پھیرتا:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی سواری لاغر وکمزوری کی بنا پر لشکر سے کوسوں دُور رہ گئی، جس کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سامان کمر پر لاد کر پاپیادہ لشکر کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا، دوسری جانب حضراتِ

صحابہؓ نے آپؐ کی عدمِ موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چھوڑ دو، اگر اس میں خیر ہوگی تو اللہ اسے تم سے ملا دیں گے؛ ورنہ وہ شامل نہ ہو سکے گا''، ابھی یہ جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اچانک دُور سے ایک پیادہ حالت کمر پر سامان لادے شخص کو آتا دیکھا گیا، جس پر بے ساختہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر جاری ہوا ''کُـن أبـاذرّ'' (مجھے اُمید ہے کہ ابوذر آیا ہوگا)، اللہ کی شان وہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہی تھے، جنہوں نے اپنی رفاقتِ کاملہ کا عملی ثبوت پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تنہا اس حال میں آتا دیکھ کر فرمایا: ''**رحـم اللّٰـه أبـاذرّ، يـمشي وحده، يموت وحده، ويبـعـث وحـده**'' (اللہ رحم فرمائے ابوذر پر، تنِ تنہا سفر کرتا ہے، سب سے دُور علیٰحدہ موت کی آغوش میں سلایا جائے گا اور آخر میں اکیلا قبر سے اُٹھایا جائے گا)؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر مقامِ ربذہ کو اہلیہ وخادم سمیت اپنا مسکن وموطن بنایا، اور عراق سے واپسی پر حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا اس مقام سے گزر ہوا، آپؓ کی نعش کو اس طرح تنہا دیکھ کر نمازِ جنازہ پڑھائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے۔ (الکامل لابن الاثیر: ۱۴۹/۲، دار الکتب العربی، بیرت، لبنان)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیت مصالح پسند حاکم کا کردار:

مقامِ تبوک پر دَورانِ قیام مختلف قبائل کے زعماءِ یہود نے خدمتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر جزیہ قبول کرنے کی درخواست پیش کی، جن میں ایلہ مقام کے سربراہ یوحنّا بن روبہ کا نام سرفہرست ملتا ہے، آپؐ نے ان تمام کی درخواست کو صلح وامن پسندی کے قیام کی خاطر قبول کیا۔

نیز حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل کے حاکم اُکیدر نصرانی کی گرفتاری کا حکم دیا اور پیش گوئی فرمائی کہ وہ جانور کا شکار کرتے ہوئے شکار ہوگا؛ چنانچہ یوں ہی ہوا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس کی تلاش میں روانہ ہوئے، تو دوسری طرف اُکیدر فلک بوس محل کی چھت پر اہلیہ سمیت شہر کے اطراف واکناف کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک اس کی نگاہ نیل گائے پر پڑی، شکار کی محبت وفریفتگی کا یہ عالم تھا کہ خود پر قابو نہ پا سکا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ گرفتار ہوا؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے جانے کے بعد ادائیگیٔ جزیہ پر مصالحت سمیت لوٹا۔ (سیرت ابنِ ہشام: ۵۲۷/۲، شرکۃ مکتبۃ مطبعۃ، مصطفی الیلبی الحلبی)

دنیا کی رذالت وعدمِ ثباتی کا ہر دم استحضار:

جب اُکیدر نصرانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو بعض صحابہؓ نے اس کے قباء کی حسن

رعنائی وملائمت کو دیکھا تو ازراہِ تعجب اس کو چھونے لگے، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے پوری امت کا رُخ درست کیا اور فرمایا کہ تم اس پر حیرت وفریفتگی میں مبتلا ہو، بخدا! جنت میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو پیش کیا جانے والا رومال اس سے بھی کئی گنا زیادہ خوبصورت وملائم ہے۔

درحقیقت یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک مصلح نبی اور عام لیڈر کے مابین، عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہو، تیروں کا مینہ برس رہا ہو، ہاتھ پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہوں جس طرح موسمِ خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہوں، عین اس وقت بھی حاکم نبی اپنے اصحاب کی تربیت کا کوئی معمولی پہلو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے۔

رفقاء کے ساتھ ایک غم خوار امیرِ کارواں کا کردار:

سفرِ تبوک میں ایک مخلص صحابی حضرت ذوالبجادین رضی اللہ عنہ[1] کا بخار کی شدت کے باعث انتقال ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفسِ نفیس ان کے تکفین وتدفین کے مراحل میں شریک رہے، حتیٰ کہ اپنے دستِ اقدس سے ان کو سپردِ خاک کر کیا یک غم خوار امیر کے کردار سے روشناس کیا اور ان کے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا:

"اللّٰهم إني أمسيت راضيا عنه فارض عنه". (رحمۃ للعالمین: ص/۱۱۸، حصہ اوّل، طبع شدہ دارالاشاعت)

تفرقہ بازی وفسادات کی دینِ اسلام میں بالکل گنجائش نہیں:

واقعہ تبوک کی روانگی سے قبل منافقین نے مسلمانوں کے مابین باہمی پھوٹ ڈالنے اور مسلمانوں کی بیخ کنی کرنے کی غرض سے ایک مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، جس کو ضرورت ومصلحت کے دلفریب جلی عنوان کے ساتھ سرکاری حیثیت دینے کی غرض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف آوری کی درخواست پیش کی گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ تبوک سے واپسی پر حاضری کا وعدہ کیا؛ مگر اللہ رب العزت نے منافقین کے عزائم اور اس نام نہاد مسجد کی قلعی کھول کر حقیقتِ حال سے آگاہ کیا؛ چنانچہ اس سلسلہ میں ان آیات کا نزول ہوا:

(۱) آپ کا نام عبداللہ تھا، والد کا سایۂ عاطفت بچپن ہی میں اُٹھ گیا تھا، پھر آپ کے چچا نے پرورش وکفالت کا ذمہ لیا، حضرت ذوالبجادین جب جوان ہوئے تو چچا نے اُونٹ، بکریاں اور علام دے کر ان کی حیثیت کو درست کیا، بہرحال دعوتِ اسلام سے متعلق سنا تو دل میں توحید کا مخفی بیج اُمڈ آیا، اور اسلام قبول کرنا چاہا؛ مگر چچا نے گھر سے علیٰحدہ کر دینے کی دھمکی دی۔ بہرحال ایمان توحید کی سلگتی آگ کو اب بجھنا تو دُور دَبنا بھی نہ تھا، یہی وجہ ہے آپ رضی اللہ عنہ گھر، مویشی وقرابت سب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حلقہ بگوشِ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر ابتلاء وآزمائش کے پہاڑ ٹوٹے، بے سروسامانی کے عالم میں اصحابِ صفہ جنہوں نے دنیاوی مال ومتاع کے بالمقابل تعلیم وتعلم اور آخرت کی دائمی نعمتوں کو ترجیح دی۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ، وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى، وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ○ لَاتَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا..... إلٰى آخر الآية﴾

ترجمہ: کچھ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد اس کام کے لیے بنائی ہے کہ (مسلمانوں کو) نقصان پہنچائیں، کافرانہ باتیں کریں، مؤمنوں میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کو ایک اڈّہ فراہم کریں جس کی پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ ہے۔ اور یہ قسمیں ضرور کھالیں گے کہ بھلائی کے سوا ہماری کوئی اور نیت نہیں ہے؛ لیکن اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم اس (نام نہاد مسجد) میں کبھی (نماز کے لیے) کھڑے مت ہونا۔

(تفسیر قرطبی: ۸/۲۵۳، ط: دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ)

اعترافِ جرم صفاءِ قلب کی علامت ہے:

ناس سفر میں صرف دس افراد بغیر کسی شک وارتیاب وعذرِ شرعی پا بہ رکاب نہ ہوسکے، جن میں کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم کے نام نمایاں تھے؛ البتہ حق وصداقت سے معمور دل نے ان حضرات کو منافقین کی طرح حیل وحجت پیش کرکے عذر خواہی کی جسارت سے باز رکھا؛ چنانچہ ندامت وپشیمانی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا؛ مگر تکوینی نظام ومصلحت کے تحت ان حضرات سے مقاطعت کلامی کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ تقریباً..... دن مقاطعت کے بعد ان تینوں حضرات کی قبولیتِ توبہ سے متعلق ان آیات کا نزول ہوا:

﴿وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا، حَتّٰى اِذَاضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَارَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّامَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ، ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا، اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ (سورۃ التوبہ، آیت نمبر: ۱۱۸)

ترجمہ: اور ان تینوں پر بھی (اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی ہے) جن کا فیصلہ ملتوی کردیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب ان پر یہ زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی، ان کی زندگیاں ان پر دُوبھر ہوگئیں اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ (کی پکڑ) سے خود اس کی پناہ میں آئے بغیر کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی، تو پھر اللہ نے ان پر رحم فرمایا؛ تاکہ وہ آئندہ اللہ ہی سے رجوع کیا کریں، یقین جانو اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تمام رشتوں سے مقدم ہے:

اس سماجی بائیکاڈ کے باعث نہایت رنج والم کی کیفیت کا سماں تھا، زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ محسوس ہورہی تھی، خویش واقارب، دوست واحباب سب بیگانے نظر آنے لگے تھے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا نہایت قریبی دوست وچچیرا بھائی ابوقتادہؓ بھی مجھے جواب نہ دیتا تھا، خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبت بھری نگاہوں سے گوشۂ چشم سے میری شکستہ حالت کو مشاہدہ فرماتے؛ مگر ان کی جانب نگاہ اُٹھتے ہی معرضانہ رویہ دل چیر دیتا تھا (صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک، رقم الحدیث: ۴۴۱۸) یہ سب اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سرنگوں ہونے کا نتیجہ تھا۔

باطل واغیار کی جانب سے دنیاوی حشم وخدم کی پیشکش:

رئیسِ غسان کو جب اس تمام واقعہ ومقاطعتِ کلامی کی اطلاع پہنچی، اس نے شام کا ایک قاصد حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور دنیاوی آسائش وآرائش کے دلفریب تخیلاتی مناظر کو بصورتِ خط پیش کیا، اس خط کا مندرجہ یہ تھا: ''ہم نے سنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہاری قدر نہ کی؛ اِس لیے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا''، حضرت کعب رضی اللہ عنہ معتوبِ نبوی ہونے کے باوجود شدید برہم ہوئے اور خط کو تنور میں جھونک دیا۔

مسلمانوں کے مابین محبت وتعلق کے جذبات:

ان پاک طینت افراد کے قلوب ایمان وایقان سے معمور تھے؛ لہٰذا اللہ کی طرف سے اجابتِ توبہ کی نوید سنائی جانے پر تمام مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، جس کی بشارت سلع نامی پہاڑ سے ایک بلند آواز شخص نے سنائی، روایت میں آتا ہے کہ یہ بلند آواز شخصیت حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ اس خوش کن خبر کو سنتے ہی حضرت کعب رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے مسجد نبویؐ میں حاضر خدمت ہوئے، صحابۂ کرامؓ جوق در جوق مبارک باد دینے لگے اور خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا، اس سلسلہ کی ایک یادگار گھڑی کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مہاجرین میں سے سب سے پہلے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ نے کھڑے ہوکر میرا استقبال کیا، مجھ سے مصافحہ کرکے گلے لگایا، میں ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھلاسکتا۔

(صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک، رقم الحدیث: ۴۴۱۸)

درست گوئی باعثِ نجات ہے:

حضرت کعب رضی اللہ عنہ توبہ کی قبولیت پر فرماتے ہیں: ''اللہ رب العزت نے اسلام کی دولت سے سرفرازی کے بعد دوسری عظیم دولت صدق گوئی کی اہمیت کو دل میں پیوستہ کیا، جس کی بدولت مجھے اس ابتلاء سے خلاصی نصیب ہوئی''؛ چنانچہ پھر عزم کیا کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور اس عہد کو تادمِ حیات بخوبی نبھا۔ (صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک، رقم الحدیث: ۴۴۱۸) نیز حدیث میں آتا ہے: ''**إن الصّدق بر وإن البرّ يهدي إلى الجنّة، وإن الكذب فجور، وإن الفجور يهدي إلى النّار**'' (سچی بات نیکی ہے اور جنت کی جانب رہنما ہے، جبکہ جھوٹ گناہ ہے، اور گناہ جہنم کی جانب مفضی ہے)۔

اصلاحِ معاشرہ

دَورِ حاضر میں اولاد کی تربیت

ازقلم: مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی، خطیب جامع مسجد خالد بن ولید فیض ٹاؤن مانسہرہ

اللہ تعالی کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت اولاد ہے، اس نعمت پر جتنا بھی اللہ تعالی کا شکر ادا کیا جائے کم ہے، اولاد کی اگر قدر سمجھنی ہے تو اس سے سمجھیں جس کو اللہ تعالی نے اولاد سے نہیں نوازا یا اس سے پوچھیں جس کو اولاد سے نواز کر پھر محروم کر دیا۔ اولاد ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں انہیں پر گھرانہ، محلّہ، شہر اور ملک وملت کی بھلائی منحصر ہوتی ہے، اولاد آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہوتی ہیں، اس لیے فطری طور پر ہر ماں باپ کی تمنا اور خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کی بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت ہو، اور یہ خواہش ہونی بھی چاہیے؛ کیونکہ والدین کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت بہتر سے بہتر طریقے سے کریں؛ کیونکہ اگر آپ ایک درخت کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں گے تو وہ بڑا ہو کر عمدہ اور اچھے پھل دیگا، اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ اگر آپ شیشے کے گلاس کو احتیاط سے رکھیں گے تو اس کے ذریعہ ٹھنڈا اور مزیدار شربت پی کر لذت محسوس کریں گے اور اگر آپ نے گلاس کو احتیاط سے نہیں رکھا تو وہ آپ کے لیے زخمی ہونے کا سبب بھی بن سکتا ہے یہی حال بچوں کی صحیح اور غلط تعلیم وتربیت کا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں نیک اولاد کی خواہش رکھنے والے تو بہت ہیں؛ بلکہ شاید ہر شخص ہی ہے؛ لیکن اس کے لیے کوشش کرنے والے اور صحیح طریقے اور تربیت کے اصولوں پر عمل کر کے انہیں راہ راست پر لانے والے بہت کم ہیں، بلکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ایسا رویہ اور طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جس سے اولاد کے سنورنے کے بجائے بگڑنے کی امید زیادہ ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ ضرورت سے زیادہ اولاد سے لاڈ پیار کرتے ہیں اور اس لاڈ پیار میں ان کی اصلاح اور تربیت سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں، بعض لوگ اپنے بچوں کو اسکولوں کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داری بھول جاتے ہیں اور پھر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ وہاں ان کو کیا پڑھایا جا رہا ہے، وہاں ان کی دینی واخلاقی تربیت کا بھی اہتمام ہے یا نہیں؟ ان کو اللہ اور رسول کا فرماں بردار بننے اور رہنے کی تلقین بھی کی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ان کو اس پر دھیان دینے کی سخت ضرورت ہے۔

یہ بات ہمارے دلوں پر نقش ہونی چاہیے کہ اولاد کو دیندار بنانے کے لیے سب سے پہلے ماں باپ کو دیندار بننا لازمی ہے، دور حاضر میں اکثر بے شعور ماں باپ کی اپنی اولاد کو دیندار دیکھنے کی خواہش تو ضرور ہوتی ہے؛ لیکن وہ خود دین پر عمل

کرنا پسند نہیں کرتے ،اور نیک اعمال وافعال سے بالکل ہی دور رہتے ہیں،ان کی اپنی زندگی میں نہ حرام وحلال کی تمیز ہوتی ہے نہ نماز کی پابندی اور نہ پردہ کا اہتمام ہوتا ہے، نہ وہ سنتوں کی پابندی کرتے ہیں، پھر بھی ان کی چاہت ہوتی ہے کہ ان کی اولاد نیک اور صالح بن جائے ،اس کے لیے وہ اپنے بچوں کو اچھے مدرسوں اور اسکولوں میں بھیجتے ہیں، باکمال اساتذہ کا انتظام کرتے ہیں، اور انہیں دینی محفلوں وغیرہ میں بھی بھیجتے ہیں، بلاشبہ یہ ساری چیزیں اچھی ہیں مگر بچے اساتذہ اور دینی محفلوں وغیرہ سے زیادہ اپنے ماں باپ اور گھریلو ماحول کو دیکھ کر اسی طرز پر زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اولاد کی تربیت بہت ہی نازک اور دیر طلب کام ہے، اس میں سب سے پہلے ماں باپ کو خود دیندار بننا ضروری ہے، خاص طور پر گناہ کبیرہ، بے نمازی پن، بے پردگی، حرام کمائی، گانے بجانے، فلمیں دیکھنے، گالی گلوج، شراب نوشی اور فضول خرچیاں وغیرہ کرنے سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہوگا؛ کیونکہ بچوں کی سب سے بڑی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان سے کہنے کی صورت میں اتنا نہیں سیکھ پاتے جتنا عملی طور پر کر کے بتانے یا کرتے ہوئے دیکھنے کی شکل میں سیکھ جاتے ہیں، چنانچہ ماں باپ کے درمیان لڑائی جھگڑے، مار پیٹ، گالی گلوج، رشتے داروں کے ساتھ نااتفاقی یا کسی قسم کے اخلاقی قدروں کو بچوں کے سامنے پامال کرنا بچوں کی تربیت کو تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔

گھروں میں عام طور پر ماں باپ اور گھر کے بڑے بزرگوں کا جیسا مزاج اور رویہ ہوتا ہے اولاد بھی اسی مزاج اور نوعیت کی تربیت پاتی ہے۔

ماں باپ ہی اولاد کے لیے سب سے پہلا، سب سے اہم، سب سے بڑا اور سب سے ضروری مدرسہ ہیں، اور بچے ماں باپ کی نصیحتوں سے اتنا کبھی نہیں سیکھ پاتے جتنا ان کے کردار اور باہمی سلوک سے سیکھتے ہیں؛ کیونکہ بچوں کی تربیت میں والدین کا ہی کردار سب سے اہم ہوتا ہے، بچہ کم عمری میں اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اسے سیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے والدین کو اپنے طرز عمل میں بہت احتیاط برتنی چاہیے، ہر طرح کے ناپسندیدہ کاموں اور غیر اسلامی حرکتوں سے اجتناب اور پرہیز کرتے ہوئے اسلامی اور اچھے اعمال وافعال کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اولاد کی تعلیم وتربیت سے بے توجہی

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جنہیں خود اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی بالکل ہی فکر نہیں ہے، وہ اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ نہ دیکر صرف اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی اولاد گلی کوچوں میں بھٹکتی پھرتی ہے، ایسے لوگ عموماً اپنے بچوں کے لیے روٹی کپڑا اور مکان کا انتظام تو کر دیتے ہیں؛ لیکن ان کی باطنی پرورش یعنی اخلاقی تربیت کی طرف بالکل ہی توجہ نہیں دیتے بلکہ بعضوں کو تو یہ پتہ ہی نہیں کہ تربیت کیا چیز ہوتی ہے؟ اور بچوں کو کیا

سکھائیں اور کیا سمجھائیں؟ اس بڑی غفلت کے وہ لوگ بھی شکار ہیں جو خود تو نمازی ہیں، اور کچھ اخلاقی آداب سے بھی واقف ہیں، پڑھے لکھے بھی ہیں؛ لیکن ملازمت یا تجارت میں اس طرح اپنے آپ کو پھنسا دیا ہے کہ بچوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے ان کے پاس گویا وقت ہی نہیں ہے، حالانکہ زیادہ کمانے کی ضرورت اولاد ہی کے لیے ہوتی ہے، جب زیادہ کمانے کی وجہ سے خود اولاد ہی کے اعمال واخلاق اور اس کے کردار کا خون ہو جائے تو ایسا کمانا کس کام کا؟

بعض لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو اچھا خاصا علم بھی رکھتے ہیں، مصلح بھی ہیں، بلکہ مرشد بھی ہیں، دنیا بھر کے لوگوں کو راہ دکھاتے ہیں، سفر پر سفر کرتے رہتے ہیں، کبھی یہاں وعظ کی، کبھی وہاں تقریر کی، کبھی کوئی کتاب لکھی یا کوئی رسالہ ترتیب دیا؛ لیکن خود اپنی اولاد کی اصلاح سے غفلت برت رہے ہیں؛ حالانکہ اپنے گھر کی خبر لینا سب سے بڑی ذمہ داری ہے، اولاد کی جانب سے جب چند سال غفلت برت لیتے ہیں اور ان کی عمر دس سے بارہ سال ہو جاتی ہے تو اب ان کو صحیح راہ پر لگانا بہت مشکل ہو جاتا ہے، بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں توجہ تو ہے؛ لیکن وہ اپنی اولاد کو حقیقی علم سے بالکل ہی محروم رکھتے ہیں، یعنی اپنی اولاد کو اسلام نہیں سکھاتے، بیس پچیس سال کی اولاد ہو جاتی ہے اور انہیں کلمہ تک یاد نہیں رہتا، یہ لوگ نہ نماز جانتے ہیں نہ اس کے فرائض وواجبات، اور نہ ہی اسلام کے بنیادی عقائد کی انہیں خبر ہوتی ہے، گویا وہ مبادیات اسلام وضروریات اسلام سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، اس بات کے جواب دہ ان کے ساتھ ان کے والدین بھی ہوں گے۔

اور بعض والدین اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کا احساس تو رکھتے ہیں لیکن اسے معمولی بات سمجھتے ہیں، جب کہ یہ بہت ہی عظیم اور اہمیت کی حامل بات ہے، اور اس جانب والدین کی کم توجہی ناقابل تلافی نقصان کا ذریعہ بن رہی ہے، اور یہ نقصان دینی بھی ہے اور دنیاوی بھی، اور اگر والدین چاہیں تو ایک ذرا سی توجہ سے انقلابی تبدیلی ظاہر ہو جائے گی (ان شاء اللہ)۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کتنے ہی والدین ایسے ہیں جنہیں دن رات اپنے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی فکر تو دامن گیر رہتی ہے اور وہ اس کے لیے کئی طرح کی قربانیاں بھی دیتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں کے علاوہ اکثر کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے آخر ایسا کیوں؟ کیونکہ کہ وہ اپنی اولاد کی بہترین تعلیم وتربیت کے خواہش مند تو ہوتے ہیں؛ لیکن اس نازک کام کے طریقوں واصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور مستقل مزاجی اور تسلسل سے یہ کام نہیں کرتے۔

بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے بارے میں کچھ اصول درج کیے جا رہے ہیں، اگر ہم نے ان کو اپنا کر اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی جانب دھیان دیا تو ان شاء اللہ ہمارے بچے دیندار اور قوم وملت کے لیے نفع بخش ثابت ہوں گے۔

بچوں کی صحیح تربیت کے لیے کچھ رہنما اصول

بچوں کی تعلیم کا ایک اہم دائرہ اس کی اچھی تربیت ہے، جو بچوں کو اپنے خاندان سے حاصل ہوتی ہے، اس تربیت کا سب سے اہم پہلو بچوں کے ساتھ والدین خاص طور پر ماں کے طرزِ عمل سے متعلق ہیں اس بارے میں کچھ اصولی باتیں درج کی جارہی ہیں۔

بنیادی دینی تعلیم:

ابتدائی عمر ہی سے بچوں کو دین کی بنیادی تعلیمات سے واقف کرایا جائے، قرآن مجید کی تعلیم کا شعوری انتظام اور حلال وحرام کے احکامات سے واقفیت فراہم کی جائے، سات سال کی عمر سے نماز کا اور روزہ رکھنے کے قابل عمر کو پہنچنے پر روزے کا عادی بنایا جائے، بچوں کو بالکل ابتداء سے اللہ کا ڈر اور اس کے سامنے تمام کاموں (اعمال) کے لیے جواب دہ ہونے کا تصور پیدا کرنا اور انہیں یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ اللہ ان کے کام کو ملاحظہ فرمارہا ہے۔

اخلاقی تربیت:

بچوں کو ابتدائی عمر سے اعلی اخلاق کا عادی بنانے کی کوشش کی جائے؛ کیونکہ بچپن کی عادتیں بڑے ہونے پر پختہ ہوتی ہیں؛ اس لیے ضروری ہے کہ بچپن ہی سے انہیں سچائی، امانتداری، بہادری، احسان شناسی، بزرگوں کی عزت، پڑوسیوں سے بہتر سلوک، دوستوں کے حقوق کی پاسداری اور مستحق لوگوں کی مدد جیسے اعلی اخلاقی اوصاف کا حامل بنایا جائے، پھر انہیں برے اخلاق مثلاً جھوٹ، چوری، گالی گلوج اور بے راہ روی سے سختی سے بچایا جائے، ابتدائی عمر سے ہی محنت ومشقت کا عادی بنایا جائے اور عیش وآرام پسندی سے دُور رکھا جائے۔

جسمانی تربیت:

والدین کی طرف سے بچوں کی جسمانی نشوونما غذا اور آرام کا خیال رکھا جائے، اور انہیں ورزش کا عادی بنایا جائے، جسمانی بیماریوں اور جائز ضروریات کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔

چار بنیادی باتیں جن سے والدین کے لیے پرہیز کرنا لازم

(۱) تحقیر آمیز سلوک: بچوں کی اصلاح وتربیت میں عجلت اور جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے صبر واستقامت کے ساتھ یہ کام کیا جائے، بچوں کی توہین وتحقیر کرنے سے گریز کیا جائے۔

(۲) سزا میں اعتدالی: بالکل سزا نہ دینا اور بہت زیادہ سزا دینا یہ دونوں باتیں غلط ہیں، بچوں کے ساتھ محبت وشفقت اور نرمی کا برتاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور معقول حد تک سرزنش کا بھی ایک مقام ہے ان دونوں رویوں میں اعتدال لازم ہے۔

(۳) بیجا لاڈ پیار: بچوں کی ہر خواہش کو پورا کرنا، غیر ضروری لاڈ پیار انہیں ضدی اور خودسر بناتا ہے اس میں بھی اعتدال نہایت ضروری ہے۔

(۴) بچوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دینا: ایک ہی گھر میں دو بچوں یا لڑکوں اور لڑکیوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا غیر اسلامی رویہ ہے، جس سے بہت سے بچے نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہوکر انتہا پسندی اور انتقام پسندی کا شکار ہوجاتے ہیں، ایسے مریضانہ رویے سے اجتناب لازم ہے۔

ان اصولی باتوں کے علاوہ چند عملی اقدامات درج کیے جارہے ہیں، جن پر والدین آسانی سے عمل کرسکتے ہیں۔

☆ خاندان میں بالخصوص بچوں کے ساتھ جہاں تک ہوسکے زیادہ وقت گزارا جائے، اپنی معاشی جدوجہد ودیگر مصروفیات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ لازماً کچھ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارا جاسکے، بچوں کی تعلیم وتربیت ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داری ہے، تربیت کا تمام تر بوجھ ماں پر ڈال دینا ایک نامناسب اور غیر معقول طریقہ ہے، مدرسے میں بچوں کی مصروفیات، دوستوں کی صحبت وغیرہ سے واقفیت کے لیے ضروری ہے کہ والدین ان کے ساتھ روزانہ کچھ نہ کچھ وقت گزاریں۔

☆ بچوں کو سخت باشی، جدوجہد اور محنت کا عادی بنانے کے لیے انہیں ایک درمیانی معیار کی زندگی کا عادی بنایا جائے؛ تاکہ وہ ایک عام انسان جیسی پرمشقت زندگی کا تجربہ حاصل کرسکیں۔

☆ اولاً تو جیب خرچ دینے سے بچا جائے، اور بچوں کی ایسی ضروریات کو خود پورا کیا جائے، اور اگر بچوں کو جیب خرچ دیا جائے تو پھر اسے ڈسپلن کا پابند بنایا جائے، بچوں سے اس رقم کا حساب بھی پوچھا جائے؛ تاکہ ان میں بچپن ہی سے کفایت شعاری بچت اور غیر ضروری اخراجات سے پرہیز کی عادت پروان چڑھے اور جواب دہی کا احساس پیدا ہو، والدین کی طرف سے اپنے بچوں کو آرام پہنچانے کی خواہش بجا ہے مگر ابتداء سے بغیر محنت کے آرام طلب بنانا ان کے مستقبل کے ساتھ سنگین مذاق ثابت ہوسکتا ہے، اسی طرح ان کے کپڑوں اور جوتوں پر اخراجات میں اعتدال رکھنا ضروری ہے؛ کیونکہ تعلیمی اداروں میں مختلف معاشی وسماجی پس منظر رکھنے والے طلبہ وطالبات ہوتے ہیں، اس طرح ان میں غیر مطلوب مقابلہ آرائی کو روکا جاسکتا ہے۔

☆ ابتداء ہی سے بچوں سے خود انحصاری یعنی اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کرنے یعنی جوتے صاف کرنے،

کمرے کو ترتیب دینے، اپنا کپڑا خود دھونے اور بستر وغیرہ لگانے اور کپڑے سمیٹنے وغیرہ کی عادت ڈالی جائے۔

☆ والدین کا یہ فرض ہے کہ بچوں کو اپنے بزرگوں کی خدمت کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔ مثلاً اپنے دادا دادی و دوسرے بزرگوں کی برابر خدمت کرتے رہیں۔

☆ بچوں کی مصروفیات اور ان کے دوستوں و ملنے جلنے والوں کو جاننا بہت ضروری ہے؛ کیونکہ جرائم کا ارتکاب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال عموماً غلط صحبت کا نتیجہ ہوتا ہے؛ اس لیے بچے کے دوستوں پر گہری نظر رکھنا والدین کی لازمی ذمہ داری ہے۔

☆ بچوں کے سامنے مدرسے یا اساتذہ یا دوسرے عزیزوں کی برائی نہ کی جائے، اگر جائز شکایت ہو تو متعلقہ ذمہ داران سے گفتگو کی جائے؛ مگر بچوں کے سامنے کبھی ان کے اساتذہ کی تحقیر نہیں ہونی چاہیے، والدین اپنے بچوں کے اساتذہ کی عزت کریں گے تو بچے بھی اس کا اچھا اثر قبول کریں گے۔

☆ اپنے بچوں کی غلطیوں اور جرائم کی صفائی نہیں پیش کرنی چاہیے، بچوں کو غلطی کا احساس دلانا اور حسبِ موقع تادیب انہیں اصلاح کا موقع فراہم کرے گی اور وہ عدل اور انصاف اور اعتدال کے تقاضوں سے واقف ہوں گے۔

☆ بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا کی جائے؛ تاکہ ملک وملت اور انسانیت کو ان کی ذات سے فائدہ ہو، موجودہ دَور میں ہر شخص اپنے حقوق کے بارے میں بہت حساس ہے؛ مگر اپنے فرائض کی ادائیگی کے بارے میں انجان بن جاتا ہے اس رویے کو تعلیمی عمل کے دوران ہی تبدیل کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے بچوں کی صحیح اسلامی تعلیم وتربیت دینے کی توفیق بخشے، تاکہ یہی ہمارے بچے کل بڑے ہوکر قوم وملت اور اپنے ملک کی خدمت کرسکیں اور نیک وصالح معاشرہ کو قائم کریں۔ (آمین یارب العالمین بحرمۃ سید الانبیاء والمرسلین)

اصلاحِ معاشرہ

پڑوسیوں کے حقوق

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدرالمدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

اسلام ایک اجتماعی زندگی گذارنے کی تلقین کرنے والا مذھب ہے، جس کی تعلیمات یہ ہیں کہ ہر مسلمان کو صرف اپنی زندگی میں مگن ہوکر اس دنیا میں نہیں رہنا ہے؛ بلکہ اس کو اپنی جیسے بہت سے انسانوں کی خبر گیری اور ضروریات کو پورا کرنے کا بھی اہتمام کرنا ہے، جس طرح والدین کے حقوق کو ادا کرنا ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے، جس طرح رشتہ داروں کے حقوق کو ادا کرنا ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے، جس طرح بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کو ادا کرنا ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے، اسی طریقہ سے ہمارے آس پاس رہنے والے جو لوگ ہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب، مسلک، مشرب سے تعلق رکھتے ہوں، محض پڑوسی ہونے کے ناطے ان کا حق ادا کرنا ایک مسلمان کا دینی وایمانی فریضہ ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالی نے اپنے حق کی ادائیگی کی تلقین کرنے کے بعد، والدین اور رشتہ داروں کے حقوق کو ادا کرنے کا حکم دیا، اس کے بعد پڑوسیوں کے حقوق ہی کو ادا کرنے کی تاکید فرمائی، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پڑوسیوں کے حقوق کو ادا کرنا کتنی اہمیت کا حامل ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ”**مازال جبرئیل یوصینی بالجار حتی ظننت أنه سیورثه**“ (أخرجه أحمد ٢٣٨/٦) حضرت جبرئیلؑ مسلسل اللہ کی طرف سے پڑوسیوں کے حقوق کو ادا کرنے کے سلسلہ میں اتنی تاکیدی احکامات لاتے رہے کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ کہیں پڑوسیوں کو وارث بنانے کا حکم بھی اللہ کی طرف سے نہ آجائے، کہیں اگلا حکم نامہ حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ لے کر نہ آئیں کہ جیسے باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اور بیٹی وارث ہوتے ہیں اسی طرح پڑوسی کے مرنے کے بعد پڑوسی کو بھی وراثت میں حق ملے گا۔ پھر پڑوسی میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے، آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں ہر جگہ صرف ”الجار“ کا لفظ ہے جس کے معنی پڑوسی کے ہیں، اس کے ساتھ مسلمان ہونے یا ہم مسلک ہونے کی کوئی قید نہیں، یعنی مطلقاً اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ چاہے کوئی بھی ہو کیسا ہی تمہارا بڑے سے بڑا دشمن ہی کیوں نہ ہو، تمہارے سلسلہ میں نفرت وبغاوت کے چاہے جتنے جذبات اپنے دل کے اندر رکھتا ہو؛ لیکن ایک مسلم ہونے کی وجہ سے تمہاری ذمہ داری اس کے ساتھ بہترین سلوک اور برتاؤ کرنے کی ہے، یہ اتنی جامع نصیحت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ اگر دنیا میں بسنے والے انسان صرف اسی ایک نصیحت پر واقعتاً عمل کرنے

والے بن جائیں تو سارے انسان محبت ومودت کی ایک لڑی میں پرودیے جائیں؛ اس لیے کہ جولوگ بھی دنیا کے اندر رہتے ہیں وہ تنہا تنہا نہیں رہتے، کوئی جنگل میں اپنا اکیلا مکان بنا کر نہیں رہتا؛ بلکہ انسان فطری طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کا مطلب وہ شہری زندگی کو اختیار کرنا چاہتا ہے، بہت سے لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا ہے؛ اس لیے کہ اس کی بہت سی ضرورتیں دوسروں سے وابستہ ہیں، سارے کام ہم اپنے خود نہیں کر سکتے؛ بلکہ بہت سے کاموں کے لیے ہمیں دوسروں کی مدد لینی ہی پڑے گی؛ اس لیے اکیلا رہنا یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے، انسان کی فطرت ہے انسانوں کے درمیان رہنا، تاکہ ضرورتیں آپسی تعاون ومدد سے پوری ہوسکیں اور جب انسان انسانوں کے درمیان ہوگا تو لازمی طور پر کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کا جار اور پڑوسی ہوگا اور ہر پڑوسی اپنے پڑوسی کے ساتھ اگر اچھا برتاو کرنے والا بن جائے گا تو جھگڑے رہیں گے کہاں؟ من مٹاؤ معاشرہ میں دیکھنے کو ملے گا کہاں؟ پھر لاٹھی ڈنڈے اٹھیں گے، کہاں؟ پھر تو محبت کی ایسی بارش ہوگی، سماج میں ایسا ماحول اور ایسی فضا قائم ہوگی جس کا نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے معاشرہ میں پیدا فرمایا تھا، جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے درس ہے۔

پڑوسیوں کے اقسام

یاد رکھیے! تین طرح کے پڑوسی ہوتے ہیں: (۱) ایک پڑوسی تو وہ ہے جو رشتہ دار بھی ہو اور مسلم بھی (۲) دوسرا وہ جو رشتہ دار نہ ہو، مسلم ہو (۳) تیسرا وہ جو مسلم بھی نہ ہو اور رشتہ دار بھی نہ ہو، ان تینوں کے حقوق برابر طریقہ سے ادا کرنا ہر انسان پر ضروری ہے، جو مسلم بھی ہے رشتہ دار بھی ہے، اس کے تین حق ہیں: (الف) پڑوسی ہونے کا حق (ب) مسلمان ہونے کا حق (ج) رشتہ دار ہونے کا حق۔

جو پڑوسی مسلم ہے، رشتہ دار نہیں ہے، اس کے دو حق ہیں: (الف) پڑوسی ہونے کا حق، (باء) مسلمان ہونے کا حق۔

تیسرا وہ پڑوسی ہے جو رشتہ دار بھی نہیں ہے، مسلمان بھی نہیں ہے، اس کا ایک حق ہے یعنی محض پڑوسی ہونے کا حق۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات وتعلیمات کے مطابق اس کا حق ادا کرنا بھی ایک مسلمان اور مومن کی ذمہ داری اور فریضہ ہے۔

پڑوسی کسے کہتے ہیں؟

پڑوس کا مطلب یہی نہیں کہ جس کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے اور جس کی دیوار ہماری دیوار سے ملی ہوئی

ہے، وہی پڑوسی ہے، حضرات علماء نے مختلف تشریحات پڑوسیوں کے تعین کے سلسلہ میں فرمائی ہیں، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے گھر کے دروازہ سے کھڑے ہوکر کسی کو آواز دیں، جہاں تک آپ کی آواز جارہی ہے، وہاں تک رہنے والے لوگ آپ کے پڑوسی ہیں ”**عن عليؓ: من سمع النداء فهو جار**“ (عمدة القاري ح: ٦٠١٤) اس اعتبار سے پورا محلّہ پڑوسی بن جائے گا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ چاروں طرف کے رہنے والے چالیس چالیس لوگ پڑوسی ہیں ”**عن عائشةؓ: حق الجوار أربعون دارا من كل جانب**“ (عمدة القاري)

بعض حضرات فرماتے ہیں جو آپ کے ساتھ مسجد میں فجر کی نماز پڑھتا ہو وہ آپ کا پڑوسی ہے۔ ”**و قيل: من صلى معك صلاة الصبح فهو جار**“ (عمدة القاري) اور پھر جس کے گھر کا اور ہمارے گھر کا راستہ ایک ہے ایک ہی گلی ہے، جس میں سے بیسیوں گھر کے راستے ہیں، پچاسوں گھر کے راستے ہیں تو جن جن گھروں کے راستے اس گلی سے گذرتے ہیں، جس گلی سے ہمیں گذرنا ہے تو اس گلی میں رہنے والے سب شرعی اعتبار سے ہمارے پڑوسی ہوں گے۔

سفر کا ساتھی

اسی طرح ہم سفر کررہے ہیں، سیٹ پر ہمارے ساتھ جو ساتھی بیٹھا ہوا ہے وہ بھی ہمارا پڑوسی ہے، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو، ہماری ذمے داری اس کے حق کو ادا کرنے کی ہے، اس کو اپنی ذات سے تکلیف نہ پہنچانے کی ہے، اس کے ساتھ ایسا اچھا برتاو کرنے کی ہے جس سے وہ ہماری شخصیت سے متاثر ہو، ہمارے اخلاق اس کے اوپر اثر ڈالنے والے ہوں اور وہ سوچنے والا ہو کہ مسلمان ایسے بلند اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔

عام طور پر سفر کے دوران بیٹھنے والے کے ساتھ اجنبی جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض دفعہ دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر سیٹ پر گنجائش بھی ہوتی ہے کسی کو بٹھانے کی، تو ہم اگر کسی انجان آدمی کو دیکھتے ہیں تو اور جگہ گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں کہ کہیں وہ ہم سے جگہ کا مطالبہ نہ کرلے؛ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اگر جگہ بھی نہیں ہے تو کسی کو آتا ہوا دیکھ کر ہم کم از کم اپنا پہلو بدل کر ایسا تاثر پیش کریں کہ گویا کہ ہم اس کے لیے دل نکال کر رکھ رہے ہیں، کسی انجان آدمی کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا جائے گا تو اس کے دل پر یقیناً اثر ہوگا؟ کیسی ہی نفرت اس کے دل میں بھری ہو، کیسی ہی دشمنی آپ کے سلسلہ میں اس کے اندر پائی جاتی ہو؛ لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ ایسا برتاو کیا تو پتھر دل انسان بھی موم کی طرح نرم ہوجائے گا، اخلاق کے اندر وہ طاقت ہے جو تیز دھار رکھنے والی تلواروں کے اندر

نہیں ہوتی، مضبوط بازوؤں کے اندر نہیں ہوتی۔ اخلاق سے انسان جتنا متاثر ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے انسان اتنا متاثر نہیں ہوتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند اخلاق کا مظاہرہ فرما کر لوگوں کو اپنے سے قریب کیا ہے اور جانی دشمنوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بنایا ہے تو ہمیں ہر محاذ پر، ہر مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور پڑوسیوں کے ساتھ بہترین برتاؤ کرنے کا جذبہ اپنے دل کے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

فرشتے بھی پڑوسی ہیں

حضرات علماء فرماتے ہیں کہ آپ کے پڑوسی صرف انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ جو دو فرشتے اللہ نے آپ کے ساتھ ہر وقت لگا رکھے ہیں وہ بھی آپ کے پڑوسی ہیں، ایک فرشتہ نیکی لکھنے والا ہے دوسرا بدی و برائی لکھنے والا ہے، ہر لمحہ یہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں، آپ کی ذمہ داری جہاں پڑوس میں رہنے والے انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی ہے وہیں اپنے ساتھ رہنے والے فرشتوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے کی ہے، جس طرح انسان کو برے برتاؤ سے تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح فرشتوں کو بھی برے برتاؤ سے تکلیف ہوتی ہے اور فرشتوں کے لیے برا برتاؤ کیا ہوگا؟ اگر ہم اللہ کی نافرمانی کریں گے، گناہ کا ارتکاب کریں گے اللہ کو ناراض کرنے والے اعمال کریں گے تو ہم اپنے اس عمل سے اپنے ساتھ رہنے والے فرشتوں کو اذیت میں مبتلا کریں گے اور ایک مسلمان کو زیب دینے والی چیز نہیں کہ وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف دینے والا بنے۔

دل بھی پڑوسی ہے

حضرات علماء فرماتے ہیں کہ جو دل اللہ نے ہمہ وقت انسان کے ساتھ لگا رکھا ہے، انسان کے اس سے زیادہ قریبی کون سا عضو ہوسکتا ہے انسان کے جسم کے نظام کو قابو میں رکھنے کے لیے اللہ نے دل کو وہ صلاحیت دی ہے کہ جو کسی دوسرے عضو کے اندر نہیں، ہمیں اس دل کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنا ہے، یعنی اس دل کو اچھے جذبات اور اچھی سوچ وفکر کا مرکز بنانا ہے، اچھے راستہ پر دل کو چلانے کی فکر کرنی ہے؛ اس لیے کہ دل کے اندر اچھے جذبات ہوں گے تو انسان کے جسم کے تمام اعضاء صحیح کام کرنے والے ہوں گے، زبان بھی صحیح کام کرے گی، ہاتھ اور پیر بھی درست کام کریں گے، آنکھیں بھی درست کام کریں گی اور دل کے اندر اگر برے جذبات ہوں گے تو پھر انسان کے جسم کے سارے اعضاء گناہ کا ارتکاب کرنے لگیں گے اور آخری بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت والجلال کے حق کی ادائیگی سب سے زیادہ ضروری ہے؛ اس لیے کہ باری تعالیٰ کی معیت اور ساتھ

ہر انسان کونصیب ہے۔ارشاد ربانی ہے’’ **وھو معکم اینما کنتم**‘‘ (الحدید) قرآن پاک میں فرمایا گیا، جہاں بھی تم ہوں گے اللہ تمہارے ساتھ ہوں گے، یعنی اللہ کی نگاہوں کے سامنے تم ہوں گے، تمہارا کوئی عمل چاہے اندھیرے سے اندھیرے کمرے کے اندر کیا گیا ہو گہری سے گہری کھائی کے اندر کیا گیا ہو اللہ کی نگاہ سے اوجھل اور پوشیدہ نہیں ہوسکتا، قرآن پاک میں فرمایا گیا’’ **و نحن اقرب الیه من حبل الورید**‘‘ (سورۂ ق) ہم شہ رگ سے زیادہ انسان کے قریب ہیں، تو اگر انسان اللہ کی نافرمانی کررہا ہے تو وہ پڑوس کی بھی حق تلفی کرنے والا ہے، کیوں کہ انسان کے لیے اللہ سے زیادہ قریبی کوئی نہیں ہوسکتا، اللہ سے زیادہ معلومات کسی انسان کے بارے میں کسی دوسری ذات کو نہیں ہوسکتی، تو پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کی جو تاکید کی گئی ہے اس میں مذکورہ تمام کے تمام اعمال آتے ہیں، اس کا دائرہ محدود نہیں بلکہ بہت وسیع ہے۔

و عن القشيري: من جيرانک الملكان فلا تو ذهما بعصيانک وراع حقهما بما تملي عليهما من إحسانک، وإذا كان جار دارک مستحقا للإحسان عليه فجار نفسک، وهو قلبک أولى، ولا تغفل عن حلول الخواطر المزوية فيه، ثم جار قلبک وهو معرفتک أولى بأن تحافظ حقها، ثم جار روحک اولى بأن تراعى حقه، ثم أولى من ذلک كله: أن لاتغفل عن قوله تعالى ’’وهومعكم اينما كنمتم‘‘ (الحديد) (الدرالمنضد ۱/۴۱۸)

تین اچھی عادتیں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: تین اچھے اخلاق جاہلیت کے زمانے میں پائے جاتے تھے اور مسلمان ان اخلاق کو اختیار کرنے کے زیادہ حقدار ہیں: (۱) اگر کوئی مہمان ان کے یہاں آتا تھا تو اس کے ساتھ وہ خوب حسنِ سلوک کرتے تھے (۲) اگر ان میں سے کوئی ضرورت مند ہوتا تو اس کی ضرورت کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ (۳) ان کا پڑوسی اگر قرض کے بوجھ تلے دب جاتا یا کسی اور پریشانی میں گرفتار ہوجاتا تو وہ اس کو قرض سے سبکدوش کرنے اور پریشانی سے نکالنے میں پوری محنت صرف کردیتے تھے۔ **وعن ابن مسعودؓ: أنه قال: ثلاثة أخلاق كانت في الجاهلية؛ والمسلمون اولى بها، أولها: لونزل بهم ضيف اجتهدوا في بره، والثانى لوكانت لواحد منهم حاجة لأخذوا في قضاء حاجة، والثالث: إذا لحق بجارهم دين أو أصابه جهد اجتهدوا حتى يقضوا دينه وأخرجوه من تلک الشدة.**

(الدرالمنضد ۱/۲۱۸)

اچھے پڑوسی کی تلاش

اچھے پڑوسی کی تلاش بھی نہایت اہم اور دینی ذمہ داری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**التمسوا الجار قبل الدار والرفيق قبل الطريق**'' گھر خریدنے سے پہلے اچھے پڑوسی کو تلاش کرو اور سفر پر جانے سے پہلے ساتھی کو تلاش کرو۔(المعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث: ٤٢٥٣)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **إن الله ليدفع بالمسلم الصالح عن مائة الف بيت من جيرانه البلاء** (رواه الطبرانی فی الكبير) اللہ رب العزت والجلال نیک مسلمان کے سبب اس کے ہمسائے میں سو گھروں سے بلا دفع فرماتے ہیں۔

ان احادیث مبارکہ سے یہ پیغام ملتا ہے کہ ہمیں اچھا پڑوسی بننے کا نمونہ پیش کرنا چاہیے، ایسا پڑوسی جس کے قریب رہائش اختیار کرنے کی لوگ آرزو اور تمنا کریں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آج انسانی سماج میں دور رہنے والے لوگوں سے دوستی ہوتی ہے اور پڑوسیوں سے معمولی معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس صورت حال کو ختم کر کے باہمی حقوق کی ادائیگی اور میل جول کے ساتھ رہنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

❑❖❑

معارف ومسائل

فجر کی سنت کب تک ادا کر سکتے ہیں؟

ازقلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

پنج وقتہ نمازوں کی سنتوں میں اصل اور بنیادی روایت حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ہے، آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"من صلّى ثنتي عشرة ركعة في اليوم، والليلة، بنى الله له بيتًا في الجنة، أربعًا قبل الظهر، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغرب، وركعتين بعد العشاء وركعتين قبل صلاة الفجر صلاة الغداة. (ترمذي، باب ماجاء في من صلّى ثنتي عشرة، رقم: ۴۱۵، **وفي رواية مسلم: قالت أم حبيبة فما تركتهنّ منذ سمعتهن الخ)** (مسلم، باب فضل السنن: ۱/۱۵۱، رقم: ۷۲۸)

"جو شخص رات ودن میں بارہ رکعتوں کی پابندی کرے، اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر فرماتے ہیں، ظہر سے پہلے چار رکعت، ظہر کے بعد دو رکعت، مغرب سے پہلے دو رکعت اور عشاء کے بعد دو رکعت اور فجر سے پہلے دو رکعت، حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا اور اس روایت کے راویوں میں سے عنبسہ، عمرو بن اَوس اور نعمان بن سالم فرماتے ہیں: جب سے ہم نے یہ حدیث سنی ہے، اس کے بعد کبھی بھی ان سنتوں کو ترک نہیں کیا ہے"۔

ان سنتوں میں سب سے زیادہ مؤکد سنت فجر کی ہے؛ اِس لیے کہ سنتِ فجر کے سلسلے میں ایسی بلیغ تاکیدات اور ترغیبات منقول ہیں جو دیگر سنتوں کے متعلق نہیں ہیں۔

سنتِ فجر کی فضیلت:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ركعتا الفجر خير من الدنيا ومافيها. (رواه مسلم، باب فضل ركعتي الفجر: ۱/۱۵۱، رقم: ۷۲۵)

"فجر کی دو سنتیں دنیا ومافیہا سے بہتر ہیں"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت میں مروی ہے:

أنّ النبي صلّى الله عليه وسلم لم يكن على شيء من النوافل معاهدة منه على ركعتين قبل الصبح. (رواه مسلم، باب تعاهد ركعتي الفجر: ۱/۱۵۱، رقم: ۷۲۴)

''آپؐ نوافل میں سنت فجر کا جتنا اہتمام فرماتے تھے ایسا اہتمام کسی دوسری نفل نماز کا نہیں فرماتے تھے''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتدعوهما، وإن طردتكم الخيل. (رواه أبو داؤد، باب ركعتي الفجر: ۱۷۹/۱، رقم الحديث: ۱۲۵۸)

''نمازِ فجر کی سنتوں کو ترک نہ کرو، اگر چہ گھوڑے تمہیں روند ڈالیں''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، آپ علیہ السلام نے فرمایا:

لاتدعو الركعتين قبل صلاة الفجر، فإن فيها الرغائب. (مجمع الزوائد: ۳۳۰۳)

''فجر کی سنتوں کو نہ چھوڑو؛ اِس لیے کہ اس میں مرغوبات ہیں یعنی اجرِ عظیم وثوابِ جزیل ہے، جن کی خواہش کی جاتی ہے''۔

سنتِ فجر کی خصوصیات:

(۱) آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنتِ فجر سے متعلق بلیغ تاکیدات ارشاد فرمائی ہیں؛ نیز بذاتِ خود آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سفر وحضر میں اس کا غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے۔

(۲) **لاصلاة بعد الفجر حتىٰ تطلع الشمس** کی وجہ سے سنتِ فجر کی ادائیگی کا وقت فوت ہو جاتا ہے، ظہر کی سنتِ قبلیہ میں فرض نماز کی ادائیگی کے بعد بھی وقت باقی رہتا ہے۔

(۳) سنت کی قضاء نہیں ہے؛ مگر فرض کے تابع ہونے کی صورت میں (لہٰذا صرف سنتِ فجر کے فوت ہونے کی صورت میں قضا ممکن نہیں)۔ (معارف السنن: ۷۴/۴)

اختلافِ ائمہ:

ظہر، عصر، مغرب اور عشاء میں جب مؤذن اقامت شروع کردے، تو سنت نماز یا کوئی نفل نماز شروع کرنا بالاتفاق درست نہیں ہے، اگر نفل نماز شروع کردی ہے اور ایک رکعت مکمل کرلی ہے تو مزید ایک رکعت جلد ادا کرکے سلام پھیر دے، اگر پہلی رکعت کا سجدہ نہیں کیا ہے، تو اسی حالت میں سلام پھیر کر فرض نماز میں شامل ہو جائے؛ لیکن فجر کی سنت میں علماء کا اختلاف ہے۔

علامہ کاشانی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں علماء کے ۹/اقوال اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ نے ۱۰/اقوال ذکر فرمائے ہیں۔

شوافع اور حنابلہ کراہت کے قائل ہیں۔

حافظ ابنِ عبدالبرؒ اقامت کے بعد کسی بھی نفل نماز کو بشمول سنتِ فجر شروع کرنے کو ناجائز کہتے ہیں۔

اصحابِ ظواہر اور غیر مقلدین احباب کہتے ہیں کہ جب مؤذن اقامت شروع کردے، تو کسی بھی نفل نماز کو اگرچہ وہ سنتِ فجر ہی کیوں نہ ہو، شروع کرنا جائز نہیں ہے، اگر شروع کردے تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ ابنِ رشد مالکیؒ نے ''بدایۃ المجتہد'' میں اختلافی اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: **هٰذا غلو منهم.** (بحوالہ اوجز المسالک: ۲/۶۶۷)

بقیہ ۶/ اقوال کے قائلین فجر کی اقامت شروع ہونے کے بعد بھی فی الجملہ سنتِ فجر کی ادائیگی کے قائل ہیں، احناف اور مالکیہ کا یہی مذہب ہے۔

احناف کے نزدیک راجح قول کے مطابق اگر سنتِ فجر کی ادائیگی کے بعد ایک رکعت، ایک روایت کے مطابق قعدے میں شرکت ہوسکتی ہے، تو سنت کی ادائیگی ضروری ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک خارج مسجد سنت ادا کرنے کے بعد فرض کی دونوں رکعتیں پاسکتا ہے تو سنت ضروری ہے، ''جلاب'' کی روایت کے مطابق سنتِ فجر کی ادائیگی ضروری ہے، اگرچہ جماعت فوت ہوجائے۔

(ملخص: از العرف الشذی: ۱/۹۷، معارف السنن: ۴/۷۲)

اگر دوسری رکعت ملنا ناممکن ہو، یا تشہد میں شرکت ناممکن ہو، تو ایسی صورت میں سنت چھوڑ دے اور جماعت میں شریک ہوجائے، اس فوت شدہ سنت کی قضاء یا بدل امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے؛ البتہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک طلوعِ شمس کے بعد سے زوال کے درمیان ادا کرسکتا ہے۔ (ہدایہ: ۱)

غرض ایں کہ احناف کے نزدیک سنت کی ادائیگی کے بعد فجر کی نماز میں ایک رکعت یا کم از کم تشہد میں امام کے ساتھ شرکت ہوسکتی ہے اور اقامت ہوچکی ہے، تو صفوفِ جماعت سے دُور یا مسجد کے خارجی حصے میں، یا مسجد بڑی ہو تو مسجد کے کنارے ایسی جگہ ادا کرے کہ جس سے امام و جماعت کی مخالفت کا خیال پیدا نہ ہو، فرض و نفل نماز کے اختلاط کا شبہ پیدا نہ ہو۔

نوٹ: بدایۃ المجتہد میں ابنِ رشد مالکیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

فجر کی سنت کے سلسلے میں مذکورہ اختلاف کی وجہ ''**إذا قيمت الصلاة، فلاصلاة إلا المكتوبة**'' کی نص فہمی ہے، جن لوگوں نے اس کی تخصیص کی ہے اُن حضرات نے فرمایا کہ اقامتِ صلاۃ کے بعد سنتِ فجر کی نہی کی علت اتصالِ صفوف، فرض و نفل کا اختلاط اور مخالفت امام وقوم ہے، جن حضرات نے اس کے عموم پر عمل کیا اُن حضرات نے نہی کی علت فرض سے اعراض اور نفل کی مشغولی قرار دیا ہے۔ (بدایۃ المجتہد بحوالہ اوجز المسالک: ۲/۶۶۷)

احناف کے دلائل:

احناف نے مذکورہ قول مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اختیار کیا ہے:

(۱) سنتِ فجر کے متعلق آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غیر معمولی ترغیبات اور تاکیدات؛ نیز آپ علیہ السلام کا سفر وحضر میں اس کا اہتمام۔

(۲) تکبیر تحریمہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے؛ لہٰذا نفل نماز اقامت شروع ہوجانے کے بعد شروع کرنا درست نہیں ہے، سنتِ فجر بھی دنیا و مافیہا سے افضل ہے؛ لہٰذا سنتِ فجر دیگر فضائل کی وجہ سے تکبیرِ تحریمہ سے افضل ہوگی؛ لہٰذا سنتِ فجر کو ادا کرنا ضروری ہے، اگرچہ تکبیر تحریمہ فوت ہوجائے۔ (بدائع الصنائع:۱/۶۴۰)

(۳) "إذا أقيمت الصلاة فلاصلاة إلا المكتوبة" یہ روایت تخصیص کا احتمال رکھتی ہے، کہ اگر صاحبِ ترتیب جس کی عشاء یا وتر کی نماز فوت ہوگئی ہو، تو اس کے لیے ان کی ادائیگی کے بعد ہی فرض کی جماعت میں شرکت ہوسکتی ہے، اس شخص کے لیے فائدہ نماز یا نمازِ وتر و فجر کی اقامت کے بعد بالاتفاق مکروہ نہیں ہے؛ لہٰذا سنتِ فجر کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر سنتِ فجر کی بھی تخصیص کی جاسکتی ہے؛ نیز عبادلہ ثلاثہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم کے آثار و عمل، حضرت حذیفہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کا سکوت، حضرت مسروق اور حسن بصری رحمہما اللہ کے فتوے کی وجہ سے احناف اور مالکیہ نے اس روایت کے عموم سے سنتِ فجر کی تخصیص کی ہے۔

عبادلہ ثلاثہ کا عمل:

(٤) عن عبدالله بن أبي موسىٰ قال جاء نا ابن مسعود، والإمام يصلي الصبح، فصلّى ركعتين إلىٰ سارية، ولم يكن صلّى ركعتي الفجر.

(رواه الطبراني، مجمع الزوائد، رقم:٢٣٩٢، ورجاله موثوقون، إعلاء السنن:٧/١٠١)

ہمارے پاس حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے جب کہ امام نمازِ فجر پڑھا رہے تھے اور آپؓ نے فجر کی سنت ادا نہیں کی تھی، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ ایک ستون کے قریب کھڑے ہوئے اور فجر کی سنت ادا کی۔

فائدہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ فجر کی سنت اقامت کے بعد داخلِ مسجد بھی صفوفِ جماعت سے الگ پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنا چاہیے، اگر اقامت کے بعد فجر کی سنت پڑھنا ناجائز ہوتا تو حضرت ابنِ مسعودؓ ہرگز نہ پڑھتے۔

(٥) عن مالک بن مغول قال سمعت نافعًا یقول: أیقظت ابن عمر رضی اللّٰہ عنه لصلاة الفجر، وقد أقیمت الصلاة فقام فصلّی رکعتین.

(رواه الطحاوی، رقم:٢٢٠٣. واسناده حسن، آثار السنن، اعلاءالسنن:١٠٢/٧)

حضرت نافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مَیں نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کو فجر کی نماز کے لیے بیدار کیا، آپؓ نے فجر کی سنت ادا نہیں فرمائی تھی اور جماعت کھڑی ہوچکی تھی، آپؓ نے اوّلاً سنت ادا فرمائی، بعدازاں جماعت کی نماز میں شرکت فرمائی۔

فائدہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ فجر کی اقامت کے بعد سنت پڑھنا جائز ہے، اگر جائز نہ ہوتا تو حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما جو ممانعت کی روایت کے بھی راوی ہیں ہرگز سنت نہ پڑھتے۔

(٦) عن أبي عثمان الأنصاري قال جاء عبد اللّٰہ بن عباس رضي اللّٰہ عنه، والإمام في صلاة الغداة، ولم یکن صلّی الرکعتین، فصلّی عبد اللّٰہ بن عباس رضی اللّٰہ عنه الرکعتین خلف الإمام، ثم دخل معهم. (رواه الطحاوي، رقم:٢٢٠١، واسناده حسن، اعلاء السنن:١٠٢/٧)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے جب کہ امام فجر کی نماز میں مشغول تھے، آپؓ نے سنت ادا نہیں فرمائی تھی، امام کے پیچھے (صفوف سے دُور) سنت ادا کرنے کے بعد امام کے ساتھ شرکت فرمائی۔

(٧) عن أبي الدرداء رضي اللّٰہ عنه أنه کان یدخل المسجد، والناس صفوف في صلاة الفجر، فیصلي الرکعتین في ناحیة المسجد، ثم یدخل مع القوم في الصلاة

(رواه الطحاوي:٢٢٠٥، واسناده حسن، آثار السنن، اعلاء السنن:١٠٦/٧)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فجر کی نماز میں حاضر ہوتے؛ جبکہ لوگ صفوں میں ہوتے (اور اگر آپؓ نے سنت نہ ادا کی ہوتی تو) مسجد کے کنارہ سنت ادا فرماتے پھر جماعت کی نماز میں شرکت فرماتے۔

(٨) عن حارثة بن مضرب أن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنه وأبا موسٰی رضي اللّٰہ عنه خرجًا من عند سعید بن العاص رضي اللّٰہ عنه، فأقیمت الصلاة، فرکع ابن مسعود رضي اللّٰہ عنه رکعتین، ثم دخل مع القوم في الصلاة، وأما أبوموسٰی رضي اللّٰہ عنه فدخل الصّف، رواه أبوبکر بن شیبة في مصنّفه، واسناده صحیح. وفیه طریق أخریٰ فجلس ابن مسعود رضي اللّٰہ عنه إلٰی أسطوانة من المسجد، فصلّی الرکعتین، ثم دخل في الصلاة، رواه الطحاوي:٢١٩٨، والطبراني، وفي اسناده لیّن. (اعلاء السنن:١٠٧/٧)

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابنِ مسعود اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس سے فجر کی نماز کے لیے نکلے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سنتِ فجر ادا فرما کر جماعت میں شریک ہوئے اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سیدھے جماعت میں شریک ہو گئے۔

فجر کی اقامت کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سنت پڑھی، حضرت حذیفہ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما نے حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ سے کوئی استفسار نہیں کیا؛ بلکہ سکوت اختیار کیا جو حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے عمل کی موافقت وتائید پر دلالت کرتا ہے۔

فائدہ: یہ تمام روایات ہمارے مدعیٰ ومقصود پر دلالت کرنے میں واضح ہیں۔

آثارِ تابعین:

(۹) عن أبي عثمان النهدي قال كنا نأتي عمر بن الخطاب رضي اللّٰه عنه قبل أن نصلي الركعتين بل الصبح، وهو في الصلاة، فنصلي في آخر المسجد، ثم ندخل مع القوم في صلاتهم. رواه الطحاوي (۲۲۰۷) واسناده حسن، آثار السنن. (اعلاء السنن:۱۰۷/۷)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ کبارِ تابعین کبارِ صحابہؓ کی موجودگی میں فجر کی اقامت کے بعد فجر کی سنت مسجد کے ایک گوشے میں ادا کرتے تھے، ان پر حضرت عمر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نکیر نہیں فرماتے تھے۔

فائدہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں فجر کی جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ دیر سے مسجد میں حاضر ہوتے، وہ سنت پڑھ کر جماعت میں شریک ہوتے تھے اور حضراتِ صحابہؓ اس پر نکیر نہیں فرماتے تھے۔

(۱۰) عن الشعبي قال كان مسروق يجيء إلى القوم، وهم في الصلاة، ولم يكن ركع ركعتي الفجر، فيصلي الركعتين في المسجد، ثم يدخل مع القوم في صلاتهم. رواه الطحاوي واسناده صحيح، وفي لفظ له قال في ناحية المسجد، آثار السنن. (اعلاء السنن:۱۰۸/۷)

حضرت مسروق اور حسن بصری رحمہما اللہ وغیرہ تابعین سے اقامت کے بعد فجر کی سنت پڑھنے کا معمول اور فتویٰ منقول ہے۔

(۱۱) عن الحارث عن علي رضي اللّٰه عنه قال كان النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم يصلي الركعتين عند الإقامة. رواه ابن ماجة (۱۱۴۷)، في باب ركعتين قبل الفجر، وفيه الحارث ضعفه بعضهم، ووثقه آخرون، وهو حسن الحديث كما مر غير مرة، وبقية رجاله ثقات (اعلاء السنن:۱۰۸/۷)

فائدہ: یہ روایت فجر کی اقامت کے بعد سنت کی ادائیگی پر صراحتاً دلالت کرتی ہے؛ لیکن یہ روایت ضعیف ہے؛ البتہ تائید کے لیے کافی ہے۔

اصحابِ ظواہر وغیر مقلدین کے دلائل اور ان کے جوابات:

(۱) عن ابن عباس رضي اللّٰه عنهما قال أقيمت الصلاة، فقمت أصلي ركعتين، فجذبني رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم، فقال: أتصلي الصبح أربعًا. رواه الحاكم في مستدركه وقال صحيح علٰى شرط مسلم ۱۱۵۴، والبيهقي، باب كراهية الاشتغال بهما. ۴۵۳، ۴۵۴، ۱۶۲، والبزار، وأبويعلٰى وابن خزيمة وابن حبان في صحيحهما ۲۴۶۹. (اعلاء السنن:۱۰۲/۷)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ فجر کی اقامت کے بعد نفل شروع کرنے والوں پر اللہ کے نبی علیہ السلام نے نکیر فرمائی ہے۔

جواب: عن أبي عثمان الأنصاري قال جاء عبد اللّٰه بن عباس رضي اللّٰه عنهما، والإمام في صلاة الغداة، ولم يكن صلى الركعتين، فصلّى عبد اللّٰه بن عباس رضي اللّٰه عنهما الركعتين خلف الإمام، ثم دخل معهم. رواه الطحاوي، رقم: ۲۲۰۱، واسناده حسن.

(اعلاء السنن:۱۰۲/۷)

فائدہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ علیہ السلام کا حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کو نماز کھڑی ہونے کے بعد فجر کی سنت ادا کرنے سے منع فرمانے کی وجہ اقامت نہیں ہے؛ بلکہ اتصالِ صفوف ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے آپ علیہ السلام کی اس نکیر کو اسی پر محمول فرمایا ہے، اگر وہی عمومی مطلب مراد ہوتا جو کہ اصحابِ ظواہر وغیر مقلدین نے سمجھا ہے، تو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ہرگز جماعت کھڑی ہوجانے کے بعد سنت ادا نہ فرماتے؛ نیز جب صحابی کی روایت اور عمل میں تعارض ہوجائے، تو راوی کا عمل حجت ہوتا ہے؛ لہٰذا اُصولِ حدیث کی رو سے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے عمل کو لیا جائے گا اور روایت میں تخصیص کی جائے گی۔ (ملخص: از اعلاء السنن: ۱۰۵/۷)

(۲) عن أبي هريرة رضي اللّٰه عنه قال، قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: إذا أقيمت الصلاة، فلاصلاة إلا المكتوبة.

(رواه مسلم، باب كراهية الشروع في النافلة، رقم: ۷۱۰، وأصحاب السنن ورواه البخاري تعليقًا)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ کسی بھی نماز کے لیے جب اقامت ہوجائے تو نفل نماز صحیح نہیں ہے۔

جواب: یہ روایت عام مخصوص منہ البعض ہے، سنتِ فجر اس سے مستثنیٰ ہے، تخصیص کی وجوہ وقرائن مندرجہ ذیل ہیں:

(الف): سنتِ فجر کی فضیلت واہمیت اور تاکید میں بے شمار روایات وارد ہوئی ہیں، اس بنا پر تخصیص ضروری ہے۔

(ب): اکابر وجلیل القدر صحابہؓ کا عمل، حضرت عمر اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں صحابہؓ وتابعینؒ کا اقامتِ صلوٰۃ کے بعد سنتِ فجر ادا کرنا، اگر سنتِ فجر مستثنیٰ نہ ہوتی، تو اکابر وجلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم منشائے نبوت کے خلاف ہرگز عمل نہ کرتے، ان حضراتِ صحابہؓ نے دیگر قرائن واحادیث کی روشنی میں سب سے پہلے تخصیص کی ہے۔

(ج): حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ممانعت کی روایت کرنا، پھر اپنی روایت کے خلاف عمل کرنا، یہ بھی تخصیص کی دلیل ہے۔

(د): احادیث میں تطبیق اور فضائل کی تکمیل کے لیے تخصیص ضروری ہے؛ تاکہ احادیث میں جمع اور فضائل کا استیفاء ہوجائے۔ (معارف السنن:۴/۷۴)

(ہ): حدیثِ باب میں کئی احتمالات ہیں: (الف) سنتِ فجر کے علاوہ نفل درست نہ ہو (ب) جس جگہ جماعت کھڑی ہوچکی ہو، صرف اس جگہ ممانعت ہو (ج) ممانعت اس شخص کے لیے ہو مکمل طور سے جس کی جماعت فوت ہوجائے وغیرہ احتمالات خود تخصیص پر دلالت کررہے ہیں۔ (ملخص: از معارف السنن:۴/۷۴)

(و): یہ روایت مرفوعاً وموقوفاً دونوں طریق سے مروی ہے، اسی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو تعلیقاً ذکر کیا ہے، شارحینِ بخاریؒ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے، اکثر محدثین نے اس روایت کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے، اگر مرفوعاً ہونا بھی ثابت ہوجائے، تو اس کا رفع قطعی نہیں ہوگا؛ لہٰذا اس روایت سے استدلال درست نہیں ہے۔ (معارف السنن:۴/۷۷، اوجز:۲/۲۶۸)

(۳) عن أبي هريرة رضي الله عنه قال، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: إذا أقيمت الصلاة، فلاصلاة إلا المكتوبة، قيل يارسول الله! ولا ركعتي الفجر، قال ولا ركعتي الفجر. بيهقي، باب كراهية الاشتغال بهما: ۱۶۴۳، رقم: ۴۵۵۰، اسناده حسن. (اعلاء السنن:۷/۱۱۱)

فائدہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ فجر کی سنت بھی جب اقامت ہوجائے تو صحیح نہیں ہے۔

جواب: اس روایت کا ایک راوی مسلم بن خالد ہے جو عمرو بن یحییٰ سے روایت کرتا ہے، مسلم بن خالد متکلم

فیہ راوی ہے اور عمرو بن یحییٰ کا حال شاگرد سے زیادہ خراب ہے، ابنِ عدیؒ نے اس روایت کو یحییٰ بن نصر کے مناکیر میں ذکر کیا ہے۔ (اعلاء السنن: ۱۱۲/۷)

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولا ركعتي الفجر" کی زیادتی مسلم بن خالد نے ہے، حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباری" میں اس روایت کو حسن قرار دیا ہے، علامہ سیوطیؒ نے "التوشیح علی البخاری" میں اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے تعجب ہے کہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو کیسے حسن کہہ دیا ہے؟ اس لیے کہ ابنِ عدی "الکامل" میں راوی کی منکر روایات ذکر کرتے ہیں اور یحییٰ بن نصر متکلم فیہ راوی؛ نیز حضرت شاہ فرماتے ہیں: یہ جزء راوی کا ادراج ہے (لہٰذا اس مدرج کا کلام سے استدلال درست نہیں ہے)۔ (العرف الشذی مع الترمذی: ۹۹/۱)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند پر کلام فرماتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ اس ٹکڑے کو صرف یحییٰ بن نصر نے بیان کیا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ حجاج بن نصر عن عباد بن کثیر عن عمرو بن دینار کی سند سے یہ روایت اِس طرح بھی نقل کی ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم إذا أقيمت الصلاة، فلاصلاة إلا المكتوبة، إلا ركعتي الصبح. (بيهقي، باب كراهية الاشتغال بهما: ۱٦٤/۳، رقم: ٤٥٥٠)

فائدہ: اس روایت سے بعض احناف نے اقامت کے بعد فجر کی سنت کے جواز پر استدلال کیا ہے؛ لیکن حجاج بن نصیر اور عباد بن کثیر یہ دونوں راوی ضعیف ہیں، جس کی وجہ سے یہ قابلِ استدلال نہیں ہے اور بیہقیؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے، حضرت شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں مذکورہ دنوں زائد اجزاء مدرج ہیں۔ (العرف الشذی: ۹۹/۱)

(۳) عن أنس رضي اللّٰه عنه خرج النبي صلّى الله عليه وسلم حين أقيمت الصلاة، فرأى ناسا يصلون بالعاجلة، فقال: أصلاتان معا؟ فنهٰى أن تصليا في المسجد إذا أقيمت الصلاة. اخرجه ابن خزيمة: رقم: ۱۱۲٦. (اعلاء السنن: ۱۱۰/۷)

آپ علیہ السلام نے چند لوگوں کو (بظاہر اقامت سے پہلے) دیکھا کہ جلد جلد نماز پڑھ رہے ہیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا: کیا ایک ساتھ دو نمازیں؟ پھر آپ علیہ السلام نے اقامت کے بعد مسجد میں فجر کی سنت پڑھنے سے منع فرمادیا۔

جواب: اس روایت میں فجر کی سنت کو مطلق ادا کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ داخل مسجد ادا کرنے سے منع کیا گیا ہے جو احناف کا مذہب ہے۔

(٤) روى عن عمر بن الخطاب أنه كان إذا رأى رجلًا يصلي وهو يسمع الإقامة ضربه.

(بيهقي، باب كراهية الاشتغال بهما:٣/١٦٤)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی شخص کو اقامت سننے کی حالت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے، تو اس کی پٹائی کرتے۔

جواب: یہ روایت بلاسند ہونے کی وجہ سے حجت نہیں ہے، اگر ثابت بھی ہوجائے، تو یہ تنبیہ فجر کی علاوہ نمازوں سے متعلق ہوسکتی ہے؛ نیز اس شخص کے لیے بھی ہوسکتی ہے جو اتصالِ صفوف یا داخل مسجد بلا حائل وغیرہ صورتوں میں نماز ادا کرے۔ (اعلاء السنن:۷/۱۰۷)

(٥) عن عبد الله بن سرجس رضي الله عنه قال دخل رجل المسجد، ورسول الله صلّى الله عليه وسلم في صلاة الغداة، فصلّى ركعتين في جانب المسجد، ثم دخل المسجد مع رسول الله صلّى الله عليه وسلم، سلّم النبي صلّى الله عليه وسلم، قال: يافلان! بأي الصلاتين اعتددت؟ بصلاتك وحدك أم بصلاتك معنا. (مسلم، باب صلاة المسافرين:١/١٤٧، رقم:٤١١)

حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نمازِ فجر میں تھے، ایک شخص مسجد میں حاضر ہوئے اور مسجد کے ایک کنارے سنت پڑھی، آپ علیہ السلام نے پھیرا اور فرمایا اے فلاں! تم کس نماز کو (فرض) شمار کروگے؟ تم نے جو انفرادی نماز پڑھی ہے، وہ فرض ہے؟ یا ہمارے ساتھ جو نماز پڑھی ہے وہ فرض ہے؟

فائدہ: اس روایت میں اقامتِ صلاۃ کے بعد مسجد کے گوشے میں بھی سنتِ فجر ادا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

(٦) عن عبد الله بن بجينة رضي الله عنه أن رسول الله صلّى الله عليه وسلم رأى رجلًا، وقد أقيمت الصلاة يصلي الركعتين، فلما انصرف رسول الله صلّى الله عليه وسلم لاث به الناس، فقال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: الصبح أربعًا، الصبح أربعا؟. (بخاري، رقم:١،٩١٦٦٣) **وفي رواية مسلم: (رقم: ٧١١) مر برجل يصلي وقد أقيمت صلاة الصبح، فكلمه بشيء لاندري ماهو؟ فلما انصرفنا احطنا به نقول: ماذا قال لک رسول الله صلّى الله عليه وسلم؟ قال، قال لي: يوشک أحدكم أن يصلي الصبح أربعا.** (اعلاء السنن:٧/١١٨)

حضرت عبداللہ بجینہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شخص کو جو اقامت (فجر) کے بعد سنت پڑھ رہا تھا دیکھا، جب آپ علیہ السلام نے سلام پھیرا، تو لوگوں نے اس شخص کو گھیر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: کیا تم صبح کی نماز چار رکعت پڑھوگے؟ مسلم شریف کی روایت میں ہے: آپ علیہ السلام کا گزر ایک شخص پر سے ہوا جو اقامت کے بعد نماز پڑھ رہا تھا، اللہ کے نبی علیہ السلام نے اس آدمی سے کچھ فرمایا،

جس کو ہم سمجھ نہیں سکے، نماز کے بعد ہم نے اس شخص سے پوچھا کہ آپ علیہ السلام نے تم سے کیا فرمایا؟ تو اس شخص نے کہا، آپ علیہ السلام نے فرمایا: قریب ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی فجر کی نماز چار رکعت پڑھنے لگے۔

(۷) عن ابن عباس رضي اللّٰه عنه إذا أقيمت صلاة الصبح، فقام رجل يصلي، فجذب رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم بثوبه، وقال: أتصلي الصبح أربعًا؟ (رواه أحمد رقم: ۲۱۳۰) ورجاله رجال الصحيح كما في مجمع الزوائد. (اعلاء السنن:۱۱۸/۷)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: صبح کی اقامت ہوچکی تھی، ایک شخص کھڑے ہوکر نماز پڑھنے لگے، آپ علیہ السلام نے اس کے کپڑے کو پکڑ کر کھینچا اور فرمایا: کیا تم صبح کی نماز چار رکعت پڑھو گے؟

جواب: مذکورہ تینوں روایات میں داخلِ مسجد نماز پڑھنے کی ممانعت، فرض ونفل کے درمیان اشتباہ کا اندیشہ، اتصالِ صفوف اور امام ومقتدیوں کی مخالفت ہے جو "**الصبح أربعًا، الصبح أربعًا؟ يوشك أحدكم أن يصلي الصبح أربعًا**" سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے؛ نیز حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما جو اس روایت کے راوی ہیں، خود انھوں نے بھی یہی مطلب سمجھا ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حارجِ مسجد یا ناحیۃ المسجد میں سنتِ فجر ادا فرمائی ہے۔ (ملخص: از اعلاء السنن:۱۱۹/۷)

عن قيس رضي اللّٰه عنه حرج رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم، فأقيمت الصلاة، فصليت معه الصبح، ثم انصرف النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم، فوجدني أصلي فقال: مهلًا ياقيس! أصلاتان معا؟ قلت: يارسول اللّٰه! إني لم أكن ركعت ركعتي الفجر، قال فلا، إذًا.

(الجامع الترمذي: ۹٦/۱، رقم: ٤٤٢)

حضرت قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ علیہ السلام باہر تشریف لے آئے، اقامت ہوچکی تھی، میں نے آپ علیہ السلام کی اقتداء میں نماز ادا کی، پھر آپ علیہ السلام نے مجھے دیکھا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، تو آپ نے فرمایا اے قیس! رُک جاؤ، میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں نے فجر کی سنت نہیں پڑھی تھی، آپ علیہ السلام نے فرمایا: تب بھی نہیں پڑھنا چاہیے۔

حضرت شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

انكاره عليه السلام مثل هٰذا الإنكار ثابت علىٰ من شرع بعد الإقامة، وقبل الإقامة، وبعد الفراغ من الفريضة، فيما سيأتي فعلم أن مناط الحكم ليس علىٰ مازعمتم بل شيء آخر، وهو عدم الفصل مكانا، والحلط مع الصفوف. (العرف الشذي مع الترمذي:۹۰/۱)

حضرت شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس شخص پر بھی نکیر فرمائی ہے جو اقامت کے بعد نماز شروع کرے یا اقامت کے قریب نماز شروع کرے، یا فرض نماز کے بعد فجر کی سنت ادا کرے، تو ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ اقامت کے بعد نفل شروع کرنے کی ممانعت کی علت اقامتِ صلوٰۃ نہیں؛ بلکہ کوئی اور چیز ہے جو ان تینوں صورتوں میں مشترک ہے؛ اِس لیے کہ نکیر اقامت سے پہلے، اقامت کے بعد؛ بلکہ فرض کے بعد بھی ثابت ہے۔ معلوم ہوا کہ ممانعت کی علت اتحادِ مکان اور صفوفِ صلاۃ سے اتصال ہے؛ لہٰذا اگر یہ دو باتیں موجود نہ ہوں، تو کراہت بھی ختم ہو جائے گی۔

نوٹ: مراجع العرف الشذی، معارف السنن، اوجز المسالک، اعلاء السنن ہیں۔ سب سے مفصل بحث اعلاء السنن میں ہے، جس میں علامہ ظفر احمد تھانوی عثمانی رحمہ اللہ نے شمس الحق عظیم آبادی کی کتاب ''اعلام اہل العصر'' کا بہترین جائزہ لیا ہے، ان کے استدلالات فاسدہ کی مدلل تردید کی ہے۔

فرض نماز کے بعد فوت شدہ سنت کی ادائیگی:

(١) عن قيس رضي الله عنه خرج رسول الله صلّى الله عليه وسلم، فأقيمت الصلاة، فصليت معه الصبح، ثم انصرف النبي صلّى الله عليه وسلم، فوجدني أصلي فقال: مهلا ياقيس! أصلاتان معا؟ قلت: يارسول الله! إني لم أكن ركعت ركعتي الفجر، قال فلا، إذًا.

(الجامع الترمذي: ٩٦/١، رقم: ٤٢٢)

حضرت قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ علیہ السلام باہر تشریف لے آئے، اقامت ہو چکی تھی، میں نے آپ علیہ السلام کی اقتداء میں نماز ادا کی، پھر آپ علیہ السلام نے مجھے دیکھا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا اے قیس! رُک جاؤ، میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں نے فجر کی سنت نہیں پڑھی تھی، آپ علیہ السلام نے فرمایا: تب بھی نہیں پڑھنا چاہیے۔

اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر کے بعد سنتِ فجر ادا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لاصلاة بعد الفجر حتى تطلع الشمس. (متفق عليه)

یہ روایت معناً متواتر ہے؛ لہٰذا نمازِ فجر کے بعد کوئی بھی نفل نماز طلوعِ شمس سے پہلے، حتیٰ کہ فوت شدہ سنت پڑھنا بھی درست نہیں ہے۔

❑❖❑